بازی مات نہیں

سندس جبیں

پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

پیش لفظ

تمام تعریفیں خدائے بزرگ و برتر کے لیے جس کی بادشاہی ازل تا ابد ہے۔ آج اپنی تیسری کتاب کے لیے پیش لفظ لکھتے ہوئے مجھے یقین نہیں ہوتا کہ یہ ''میں'' ہوں۔ جسے خدا نے اپنی بے پناہ رحمتوں کے لیے چُنا اور میرے قارئین کی اتنی ڈھیر ساری محبت میری قسمت میں لکھ دی۔

زیرِ نظر کتاب ''بازی مات نہیں'' ایک رنگا رنگ گلدستہ ہے۔ یہ کوئی طوفانی محبت کی داستان نہیں ہے۔ یہ تو احساس ہے..... ایک دھیما دھیما سا احساس..... کہ زندگی میں ہار، جیت ہمیشہ ہی بہت اہم ہوتی ہے۔

میری ہمیشہ سے کوشش رہی ہے کہ صرف وہ لکھوں جو میں لکھنا چاہتی ہوں..... یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ موضوعات کا چناؤ خواہ اتنا وسیع نہ ہو مگر میں نے اسے طرزِ تحریر سے خاص بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ میں اپنی اس کوشش میں کس حد کامیاب ہوں اس کا فیصلہ قارئین پہ چھوڑتی ہوں۔

گل فراز بھائی کا تہہ دِل سے شکریہ ادا کروں گی جن کی شفقت اور محنت کی وجہ سے میری ایک سال مَیں تین کتابیں منظرِ عام پہ آ سکیں۔

دعاؤں کی طالب

سُندس جبین

22 نومبر 2011ء

''مجھے کچھ کہنا ہے''!

سُندس جبین کا نام اب کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے اپنی پہلی کتاب ''اس کارِ جنوں میں'' کی اشاعت نے اس پر قارئین کی محبتوں کی بارش کر دی۔ سُندس کو ڈائجسٹ میں لکھتے تو تین سال ہو چکے ہیں مگر، صاحبِ کتاب ہوئے ابھی ایک سال ہی ہوا ہے! اور جس طرح اس نے اپنی پہلی کتاب میں، محبت اور سیاست کا حسین امتزاج بڑی خوبصورتی اور مہارت کے ساتھ پیش کیا ہے۔

اور جس طرح انہوں نے دو متضاد چیزوں کو (Blend) کیا ہے وہ یقیناً اسی کا خاصہ ہے، میرا سُندس جبین سے پہلا تعارف ڈیڑھ سال پہلے ''ایم اے انگلش'' کی کلاس میں ایک پروفیسر کی حیثیت سے ہوا۔ اس ڈیڑھ سالہ تعلق کو مدِ نظر رکھتے ہوئے، میں بتا سکتی ہوں کہ وہ اپنی عام زندگی میں ایک چُلبلی سی سٹوڈنٹ گرل نظر آتی ہے۔ جسے دیکھنے والا یہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ بظاہر یہ نرم و نازک دیکھائی دیتی لڑکی جب جب قلم اٹھاتی ہے تو کیا کمال کرتی ہے۔

سُندس کے ساتھ میرا استاد اور شاگرد کا رشتہ اب تو کچھ دیر کا مہمان ہے۔ مگر میرا اس سے ایک قاری کا رشتہ تاحیات چلے گا۔ الغرض آپ چاہیں (exaggeration) یا ایک استاد کا اپنا شاگرد کے لیے جانبدارانہ رویہ مگر یہ حقیقت ہے کہ سُندس جبین ایک بہت خوبصورت دل کی مالکہ اور احساسات و جذبات کو بہت خوبصورت پیرائے میں بیان کرنے والی مصنفہ ہے۔

خدا، اس کو یونہی کامیابی و کامرانی عطا فرمائے! آمین!

مسز عظمیٰ فرہاد
لیکچرار انگلش
ملت سائنس کالج، گوجرانوالہ

بازی مات نہیں

وہ یک ٹک سامنے بیٹھی کمپیئر و ہوسٹ کو دیکھ رہا تھا، بہت خوبصورت صوفہ سیٹ پر نزاکت سے براجمان وہ اسٹوڈیو میں موجو ہر چیز پر حاوی لگ رہی تھی، اس کا انداز گفتگو اس کا لباس اور اس کا خوبصورت لب ولہجہ، ہر چیز پرفیکٹ تھی۔

وہ اسے پہلی بار نہیں دیکھ رہا تھا، بچپن سے اب تک وہ کم از کم سینکڑوں بار اسے دیکھ چکا تھا مگر اسے نہیں یاد تھا کہ کبھی اس کے دل نے اسے قریب سے دیکھنے کی خواہش کی ہو۔ مگر آج اس پل..... اس لمحے اس کا شدت سے دل چاہا کہ وہ اسے غور سے دیکھے، قریب سے جانچے، اس کی خوبصورتی کو محسوس کرے، اسے حیرت ہوئی اسے آج تک اس کی یہ خوبصورتی کیوں نظر نہیں آئی تھی۔

وہ اس شو میں انٹرویو کے لیے مدعو تھا۔ وہ احسن رضا تھا، ٹاپ کلاس ماڈل اور ایکٹر، جس کے ایک انٹرویو کے لیے اس نجی چینل کو کتنی بے شمار کوششیں کرنی پڑی تھیں، کتنی ڈھیر اپائنٹ مینٹس لینے کے بعد وہ اس شو میں آنے پر تیار ہوا تھا۔ اسے یاد آیا کہ اس کے کچھ دوستوں نے اسے خاص طور پر خبردار کیا تھا کہ وہ ''حفصہ طاہر'' سے ذرا بچ کر رہے وہ بہت تیکھے سوال کرتی ہے، اس کے لہجے میں بڑی طنزیہ کاٹ تھی اور وہ مقابل کو لاجواب کرنے کا فن جانتی تھی لیکن اس نے ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا دیا۔ اگر وہ تیکھے لب و لہجے کی حامل تھی تو وہ بھی جارحانہ مزاج کے لیے مشہور تھا۔ اس کے خواب وخیال میں بھی اس وقت یہ بات نہیں تھی کہ وہ اس حفصہ طاہر کا سامنا کرنے والا ہے۔

وہ فل تیاری کے ساتھ آیا تھا لیکن شو شروع ہونے سے پہلے ہی اس کے تاثرات بدل گئے جب اس نے ہوسٹ کی سیٹ پر حفصہ طاہر کو براجمان دیکھا وہ اس وقت لانگ شرٹ اور بلیک ٹراؤزر میں ملبوس تھی اور بلیک ہی دوپٹہ اوڑھے ہوئے تھی، اس کے سیدھے بال لیئرز کی شکل میں کٹے ہوئے تھے اور ان کا رنگ بھی مشرق و مغرب کا ملا ہوا تاثر دے رہا تھا، شفاف چمکتا ہوا چہرہ نفاست سے کئے گئے میک اپ سے مزید نکھر گیا تھا۔ اس کا بااعتماد انداز، خوبصورت لب و لہجہ اور دلکش مسکراہٹ سب ہی اتنی شاکنگ تھی کہ وہ اس کے خوش آمدید کا کیسے جواب دے، اسے فوری طور پر سمجھ میں نہ آیا۔

اس کی حیرت کو نوٹس کیے بغیر وہ اپنے سامنے رکھی کیو شیٹ سے دیکھتی سوال شروع کر چکی تھی۔ وہ اتنا شاکڈ تھا یا شاید کنفیوژ کہ اپنا اعتماد سے محروم لہجہ اور آواز کی لڑکھڑاہٹ اسے ابتدائی چند جوابوں سے ہی پتا چل گئی، ابھی تو صرف آغاز تھا، رفتہ رفتہ شو کلائمکس پر پہنچ رہا تھا، اس کے سوالات واقعتاً بے حد تیکھے اور نوکیلے تھے اور اس پر اس کی طنزیہ مسکراہٹ، وہ اپنی ساری چوکڑی بھول گیا۔

حفصہ نے اس کی ہر چیز کو موضوع گفتگو بنایا تھا اس کے کپڑوں سے لے کر اس کے افیئر زتک اور اس کی دلچسپیوں سے لے کر اس کے لیے آنے والی فی میل فینز کی فون کالز تک۔

احسن کو حیرت ہو رہی تھی کہ وہ اس کے متعلق ہر بات جانتی تھی اس کی معلومات اور دلائل بہت وزنی تھے، یقیناً اس نے احسن رضا پر مکمل ہوم ورک کیا تھا مگر نہیں..... اسے ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ تو اس کے بارے میں یقیناً سب کچھ پہلے سے ہی جانتی تھی۔

اس انٹرویو نے اس کے کیریئر کے اب تک کے دیئے گئے تمام انٹرویوز کا کباڑہ کر کے رکھ دیا تھا اور اختتام تک اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اٹھ کر بھاگ جائے، کتنی ہی بار اس نے پانی پیا، ماتھے پر آیا پسینہ پونچھا اور ایسے میں حفصہ طاہر کی زہریلی نگاہیں وہ صاف خود پر جمی محسوس کر رہا تھا۔ جن میں کاٹ تھی، استہزاء تھا۔ وہ جیسے ایک ہی انٹرویو کے نتیجے میں سپر اسٹار سے مضحکہ خیز بن چکا تھا۔

بہت عجیب بات تھی اس رات گھر واپس آ کر وہ بہت دیر تک اپنے بیڈ پر ساکت پڑی رہی تھی۔ اسے تو خوش ہونا چاہئے تھا، آج اس نے احسن رضا کا غرور خاک میں ملا دیا تھا، آج تو جشن کی رات تھی مگر اس کے اندر خوشی کی کوئی رمق نہیں تھی، صرف ایک جامد سناٹا

تھا، جو اس کو گھیرے میں لیے ہوئے تھا۔ اس نے آنکھوں کو مسل کر اپنی تھکن کو کم کرنا چاہا مگر بے سود.....! اچانک اس کی نظر ٹیبل کیلنڈر پر پڑی اس نے بے ساختہ ہاتھ بڑھا کر کیلنڈر اٹھا لیا۔ دن، مہینے، سال ایک دم پیچھے چلے گئے، پانچ سال پیچھے۔ اس کے کانوں میں اس کی اپنی آواز گونج رہی تھی۔

''آپ میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتے احسن! آپ یہ مت کہیں کہ آپ مجھ سے محبت نہیں کرتے..... آپ تو یہ مت کہیں..... میں مر جاؤں گی احسن۔ میں آپ کے بغیر مر جاؤں گی.....'' وہ گھٹنوں کے بل زمین پہ گری سسک رہی تھی۔ احسن دم بخود اس کے سامنے کھڑا تھا۔

''اپنی بکواس بند کرو۔ تمہیں شرم آنی چاہئے مجھ سے اس قسم کی باتیں کرتے ہوئے۔ ہو کیا تم؟ ذرا شکل دیکھو اپنی..... کیا تم اس قابل ہو کہ کوئی تم سے محبت کرے..... دفع ہو جاؤ یہاں سے.....'' وہ دہاڑ رہا تھا پھر اس نے حفصہ کو کلائی سے گھسیٹ کر اپنے کمرے سے باہر نکال دیا۔

وہ ساکت تھی، اس کے کانوں میں احسن کی آواز گونج رہی تھی۔

''کیا تم اس قابل ہو.....'' وہ لڑکھڑاتے قدموں سے اپنے کمرے کی طرف چل دی۔ آئینے کے سامنے کھڑی وہ اپنے آپ کو دیکھ رہی تھی۔ گندمی رنگت، روئی روئی سیاہ آنکھیں، الجھے بکھرے بال اور ڈھیلا ڈھالا سا سوٹ، شاید وہ واقعی محبت تو کیا توجہ کے قابل بھی نہ تھی۔ وہ یک ٹک آئینے کو گھور رہی تھی جب اچانک سیل فون کی تیز آواز اسے کسی ٹائم مشین کے ذریعے ماضی سے حال میں کھینچ لائی اس نے آنکھیں مسلیں، خشک، بے رونق اور ویران آنکھیں، یوں جیسے انہوں نے اپنے حصے کے سارے خواب دیکھ لیے ہوں۔ اس نے بے تاثر چہرے کے ساتھ سیل فون اٹھایا۔ اسکرین پر ''عباد کالنگ'' کے الفاظ جگمگا رہے تھے۔ ایک طویل سانس لے کر اس نے ''یس'' پریس کیا اور فون کان سے لگا لیا۔

''کیسے ہو عباد؟'' اس کا لہجہ یکسر بدلا ہوا تھا۔ دوسری طرف وہ تھکی تھکی سی ہنسی ہنس دیا۔

''ٹھیک ہوں..... تم؟''

''میں ٹھیک ہوں۔''

''مصروف تو نہیں تھیں.....؟''

''نہیں.....''

''حفصہ.....'' وہ سرد آہ بھر کر بولا۔ ''اور کتنا انتظار کراؤ گی؟'' کتنی تڑپ اور بے تابی تھی اس کے لہجے میں۔ وہ لب کچل کر رہ گئی۔

''بولو ناں؟ تم چپ کیوں ہو؟'' وہ خفیف سی بے چینی سے بولا تھا۔

''بس چند دن اور.....''

''صرف چند دن ناں، دیکھ لو.....کہیں پھر.....'' وہ تصدیقی انداز میں پوچھنے لگا۔

''نہیں، صرف چند دن دو مجھے۔'' وہ مستحکم لہجے میں بولی تھی۔

''او کے.....'' وہ سرشار سا بولا تھا۔

''میں فون رکھ دوں.....؟'' حفصہ نے اجازت طلب کی۔

''ہاں.....گڈ نائٹ۔'' وہ کھل کر ہنسا تھا اس کے انداز پر۔

حفصہ نے فون آف کر کے سائیڈ ٹیبل پر دھرا اور پیروں میں چپل ڈالتی واش روم کی سمت بڑھ گئی۔

ماضی کی کتاب کا ایک ورق کھلا تھا، اس نے پڑھا اور کتاب بند کر دی، دل تو یہ چاہتا تھا کہ وہ اس ورق کو کتاب زیست سے ہی الگ کر دے مگر یہ اپنے اختیار میں کہاں تھا۔

احسن رضا سے اس کی پہلی ملاقات اپنے بڑے ماموں کے گھر ہوئی تھی۔ وہ ان کا سب سے چھوٹا، لاڈلا اور ضدی بیٹا تھا، جو اپنی مرضی سے لاہور ہاسٹل میں پڑھ رہا تھا۔ حفصہ نے شاید کبھی بچپن میں اسے دیکھا ہو مگر اسے یاد نہیں تھا، اب یوں اچانک وہ اسے دیکھ کر دنگ سی رہ گئی تھی، وہ بہت وجیہہ اور خوبصورت تھا، اسے یاد نہیں آ سکا کہ اس نے احسن رضا سے زیادہ کوئی مرد اتنا ہینڈسم دیکھا ہو۔ وہ چند پل منہ کھولے اسے تکتی رہی تھی۔ جب کہ وہ اس کے سلام کا جواب صرف سرسری سے انداز میں سر ہلا کر دیتے ہوئے آگے بڑھ گیا تھا۔

وہ بری طرح اس کے سحر میں گرفتار ہو گئی تھی۔ وہ اس سے بے انتہا متاثر تھی، اس کی خوبصورتی سے، اس کی وجاہت سے، اس کی ذہانت سے اور شاید اس کے غرور سے بھی۔

☆☆☆

احسن نے اپنا ایم بی اے ادھورا چھوڑ دیا تھا، کیونکہ اسے ماڈلنگ کی آفر آ گئی تھی، اس نے ابتدائی طور پر دو تین کمرشلز کیے پھر تو جیسے دولت اور شہرت اس پر ٹوٹ کر برسنے لگی، دن بدن اس کی مصروفیات میں اضافہ ہوتا گیا، ماڈلنگ کے بعد اس نے اگلا قدم ایکٹنگ کے شعبہ میں

رکھا تھا۔ جانے کیا بات تھی کہ وہ ہمیشہ ہر معاملے میں انتہائی خوش قسمت ثابت ہوا تھا۔ پہلے اپنی مرضی سے ہاسٹل جانے کا شوشہ چھوڑ دیا، پھر اپنی اسٹڈیز مکمل کیے بغیر ہی شوبز کی دنیا میں قدم رکھ دیا، ماموں اور ممانی پہلے تو خفا ہوئے مگر اس کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کے پیش نظر ہار مان بیٹھے۔ ماڈلنگ اور کمرشل کے بعد اس نے ایکٹنگ میں طبع آزمائی کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

اپنے اس فیصلے کے متعلق اس نے ایک صبح ناشتے کی میز پر بہت اطمینان سے اپنے والدین کو آگاہ کیا تھا۔ حسب توقع رضا حسین فوراً غصے میں آ گئے تھے، وہ اس کی بے پرواہی اور کھلنڈرانہ طبع سے سخت عاجز تھے، انہوں نے اسے بے نقط سنانے کے بعد دوٹوک انداز میں اپنا فیصلہ سنایا تھا کہ ''اب اسے انسانوں کی طرح ان کا آفس جوائن کرنا چاہیے۔''

وہ حقیقتاً اس کے حوالے سے سخت پریشان تھے، وہ ان کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا، ان کے بڑے دو بیٹوں میں سے ایک ڈاکٹر تھا اور دوسرا سول سروس میں تھا جب کہ تیسرے نمبر پر احسن تھا جس نے ہمیشہ اپنی مرضی کی تھی، وہ حد درجہ ضدی اور تلخ مزاج تھا، اکثر اس کی شکایتوں اور حرکتوں کی رپورٹس رضا حسین کو ملتی رہتی تھیں، جس پر وہ اسے ڈانٹتے ڈپٹتے بھی تھے مگر اس پر سختی کرنے کا انہوں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا، احسن کے اے لیویز کے دوران انہوں نے ایسی کوشش کی تھی مگر انہیں اس کا خمیازہ اس قدر برا بھگتنا پڑا تھا کہ اس کے بعد وہ ڈر سے گئے تھے، دوبارہ اسے سزا دینے سے انہوں نے گریز کیا تھا۔

اے لیویز کا رزلٹ آنے سے پہلے ہی وہ ہاسٹل جانے کی ضد لگا چکا تھا، عالیہ نے ہر طریقے سے اسے سمجھانے اور منانے کی کوشش کی مگر وہ اپنی ضد پہ اڑا رہا اور حسب توقع اس نے اپنی بات منوا لی تھی، اس کے بعد وہ لاہور چلا گیا، وہ اپنے والدین سے کبھی بھی اتنا اٹیچ نہیں تھا کہ کسی قسم کی پریشانی کا شکار ہوتا اس لیے بڑے اطمینان سے مہینے دو مہینے بعد اپنی شکل دکھانے آ جاتا۔

لاہور جا کر بھی اس کی حالت اور فطرت میں کوئی فرق نہیں آیا تھا، رضا حسین کو اس کی شکایتیں ملتی رہتیں۔ اگرچہ اب ان کی نوعیت بدل چکی تھی وہ اس کی حرکتوں سے سخت نالاں تھے، مگر مجبوری یہ تھی کہ وہ ان کی دسترس سے دور تھا اور اگر ان کی دسترس میں ہوتا بھی تو وہ اسے کچھ نہیں کہہ سکتے تھے اس لیے یہ دوری و نزدیکی کا فلسفہ تو بے سود تھا۔ جتنا احسن نے انہیں تنگ کیا تھا اتنا تو ان کے دونوں بیٹوں نے مل کر بھی نہیں کیا تھا۔ دس پندرہ دن بعد جیسے انہیں انتظار سا ہوتا

کہ اب لاہور سے کیا خبر آئے گی؟ یا اس بار احسن نے کیا کارنامہ سرانجام دیا تھا؟

ایم بی اے میں آ کر یہ سلسلہ قدرے تھما تو رضا حسین نے سکون کا سانس لیا تھا مگر ان کا یہ سکون دیرپا ثابت نہیں ہو سکا تھا۔ جلد ہی انہیں اطلاع ملی کہ وہ کوئی کمرشل سائن کر چکا تھا، وہ ہر بار کی طرح اس بار بھی نئے سرے سے مضطرب ہو گئے تھے۔ ان کی سات پشتوں میں بھی کوئی شوبز سے وابستہ نہیں تھا، اسی لیے وہ اپنی ساری مصروفیات ترک کر کے پہلی فلائٹ سے لاہور پہنچے تھے۔

ڈیڑھ گھنٹہ مسلسل اس کے ساتھ بحث کرنے کے بعد بھی وہ اسے اس کے موقف سے نہیں ہٹا سکے تھے۔ اس کی ہٹ دھرمی ہمیشہ کی طرح عروج پر تھی، تھک کر وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے تھے کہ شاید احسن نے لاہور میں رہ کر کوئی خصوصی سرٹیفکیٹ حاصل کر لیا تھا انہیں تنگ کرنے کا۔ وہ انہیں نت نئے طریقوں سے زچ کرتا رہتا تھا، اگلی شام وہ تھکے ہارے ناکام سے اسلام آباد لوٹ آئے تھے، اس کے سوا ان کے پاس کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔

اصل میں تو ان کے پاؤں تلے سے زمین تب نکلی جب وہ اپنا ایم بی اے ادھورا چھوڑ کر اسلام آباد واپس آ گیا، اپنے اس فیصلے کے متعلق اس نے بڑے اطمینان سے انہیں آگاہ کیا تھا اور ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا تھا کہ وہ عنقریب ایک نجی چینل کے ساتھ ایک سوپ سیریل کا معاہدہ سائن کرنے والا تھا۔ رضا حسین کا غصے اور طیش کے مارے برا حال تھا وہ اس بار اسے قطعی طور پر بخشنے کے موڈ میں نہیں تھے، انہوں نے اچھا خاصا اسے لتاڑ کر رکھ دیا تھا، وہ ان سے اتنی انسلٹ کروانے کے بعد بھی اپنے فیصلے سے انچ بھر بھی ہٹنے کو تیار نہیں تھا، بہت دن گھر میں کشیدگی رہی، دونوں فریق ہی از حد ضدی اور اکھڑ تھے، کوئی بھی جھکنے کو تیار نہیں تھا۔ رضا حسین چاہتے تھے کہ وہ ان کے ساتھ بزنس میں ہاتھ بٹائے، جبھی وہ مطمئن تھے کہ خواہ اس کے متعلق ان کے پاس شکایتوں کا پلندہ موجود تھا مگر وہ بزنس بڑھا رہا تھا، ان کے انٹرسٹ میں یہی کافی تھا، اس سے ان کا بوجھ کافی حد تک کم ہو جاتا۔ مگر وہ بھی احسن رضا تھا جس کی کوئی کل سیدھی نہ تھی۔ اس نے کسی کو بھی خاطر میں لائے بغیر اپنے کہے پر عمل کر دکھایا تھا۔

حفصہ جب پہلی بار اس سے ملی تو اسے سوپ سیریل کی شوٹنگ میں بزی ہوئے ابھی چند ہفتے ہی ہوئے تھے اور وہ بے حد مصروف تھا۔ حفصہ نے اپنے گاؤں کے نزدیکی کالج سے گریجویشن کیا تھا، چونکہ نزدیک کوئی بھی پوسٹ گریجویٹ کالج یا یونیورسٹی نہیں تھی اس لیے رضا

ماموں کے شدید اصرار پر وہ لاہور آ گئی، ماسٹرز کے لیے۔ اس نے جرنلزم میں ماسٹرز کرنے کا سوچا تھا۔ جرنلزم اس کا فیورسٹ سبجیکٹ تھا اور اس کے ہمیشہ اس سبجیکٹ میں بہت اچھے مارکس آتے تھے، ممانی اتنی اچھی تھیں کہ اسے اماں کی کمی نہ محسوس ہونے دیتیں، آج انہوں نے اسے یونیورسٹی کے فارم منگوا دیئے تھے۔

شام کو جھٹپٹا سا پھیل رہا تھا جب وہ ہاتھ میں بلیو فائل تھامے باہر آئی، ارادہ تھا کہ تسلی سے بیٹھ کر فارم فل کرے گی، لان میں ممانی کے ساتھ بیٹھے احسن کو دیکھ کر وہ بھرپور انداز میں چونکی، پھر بے اختیار اس طرف بڑھ آئی تھی۔ ممانی جان نے اسے چائے کی پیش کش کی جسے اس نے نرمی سے رد کر دیا۔ اسے چائے پینے کی عادت نہیں تھی۔

احسن کی مطلق توجہ اس کی طرف نہیں تھی وہ بڑے مگن انداز میں چائے کے سپ لیتے ہوئے ممانی جان سے باتوں میں مصروف تھا۔ وہ اپنے فارم کو یکسر بھول چکی تھی، اس کی ساری توجہ احسن کی طرف تھی، اس کے بات کرنے کا انداز بہت خوبصورت تھا، وہ یک ٹک اس کی طرف دیکھ رہی تھی، جب بات کرتے کرتے یکلخت احسن کی نظر اس پر پڑی، وہ اسے یونہی ٹکٹکی باندھے اپنی طرف دیکھتا پا کر چونکا، پھر اس کے لبوں پر ایک مغرور مسکراہٹ آ گئی۔ اسے اپنی دل آویز شخصیت کا بخوبی اندازہ تھا، اس کے لیے یہ سب نیا نہیں تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ اٹھ کر چلا گیا۔ وہ اپنی پشت پر اس کی جمی ہوئی نظریں محسوس کرتا محظوظ ہوتا کار اسٹارٹ کرنے لگا۔

پھر یہی ہونے لگا، وہ اکثر اسے دیکھتی رہتی، اس نے کبھی اس سے مخاطب ہونے کی کوشش نہیں کی تھی۔ یہ چیز احسن کے لیے خاصی حیران کن تھی، اس کا خیال تھا کہ وہ اس کے قریب آنے کے لیے گپ شپ یا دوستی کا سہارا تو ضرور لے گی، اسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ ایک صبح وہ کسی کام کے سلسلے میں جا رہا تھا جب وہ یک دم بھاگتی ہوئی پورچ میں آئی تھی۔ اس کی سانس غیر متوازن تھی۔

''احسن! آپ مجھے یونیورسٹی ڈراپ کر دیں گے؟''

احسن نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا، لمبی قمیض اور کھلی شلوار میں دوپٹہ سر پر جمائے، کس کے باندھی چوٹی میں اس کا حلیہ خاصا مضحکہ خیز تھا، البتہ اس کا لہجہ بہت شائستہ تھا۔

''ہاں، ہاں کیوں نہیں۔'' احسن نے گاڑی کا ڈور اَن لاک کرتے ہوئے اشارہ کیا۔

گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے اس نے نظریں اس پر جمائیں۔

''مس حفصہ! کیا پڑھتی ہیں آپ؟'' احسن نے پوچھا، وہ اس کے یوں نظر جما کر دیکھنے سے ایک دم کنفیوژ ہوئی تھی، احسن کو دل ہی دل میں ہنسی آئی، کہنے کو یونیورسٹی اسٹوڈنٹ اور اعتماد کا نام نہیں اس نے استہزائیہ انداز میں سوچا۔

''میں جرنلزم میں ماسٹرز کر رہی ہوں۔'' وہ نظریں جھکا کر بولی۔

''آگے کیا کرنے کا ارادہ ہے؟''

''پتا نہیں.....''

''کیوں پتا نہیں؟'' احسن کو حیرت ہوئی۔

''میں نے ابھی سوچا نہیں۔'' وہ قدرے گڑبڑا کر بولی۔

احسن نے اثبات میں سر ہلا کر توجہ ڈرائیونگ پر مرکوز کر لی۔ باقی سارے رستے خاموش رہی تھی۔ وہ جیسے ابھی تک اس محسور کن سفر کے خمار میں گم تھی۔

چند دن مزید سرکے، اب وہ ناشتے کی ٹیبل پر اس کا حال احوال دریافت کر لیا کرتا تھا۔ وہ اسی پر خوش تھی۔ اپنی پڑھائی میں پوری طرح مگن تھی، اس کا حلیہ اب بھی ویسا تھا، یونیورسٹی کا ماحول بھی اس پر اثر انداز نہیں ہو سکا تھا، زندگی میں بڑی خوش گوار تبدیلی آئی تھی۔ وہ زندگی جو پہلے بڑی سپاٹ اور بے رنگ سی لگتی تھی اب یک دم جیسے خوشگوار رنگوں سے مزین ہو گئی تھی۔ وہ مور کی طرح رقص عشق میں گم اپنے بھدے پاؤں یکسر فراموش کر چکی تھی۔ اس نے کبھی یہ سوچنے کی زحمت نہیں کی کہ احسن اس کے بارے میں کیا خیالات رکھتا تھا، اسے لگتا سب اس کی سوچ کی طرح اچھا اچھا ہی ہوتا ہے اور رہے گا۔ احسن کا پہلا سوپ سیریل آن ایئر گیا اور اور اسے توقع سے زیادہ کامیابی ملی تھی، اسی خوشی میں اس نے گھر میں ایک گرینڈ پارٹی رکھی تھی۔ اس پارٹی میں اس کی کو اسٹار بھی آئی تھی، وہ ایک مشہور اور ٹاپ کلاس ایکٹرس تھی جو کہ احسن کی سنگت میں خاصی خوش نظر آ رہی تھی۔ حفصہ خاموشی سے اسے احسن کے ساتھ دیکھ رہی تھی مگر ایک عجیب سی آنچ اٹھ رہی تھی اس کے اندر سے، اسے برداشت کرنا بہت مشکل ہو رہا تھا، پارٹی ختم ہونے کے بعد وہ اپنے کمرے میں جا رہا تھا جب حفصہ اس کے سامنے آ گئی، وہ رک گیا۔

''سارہ آپ کے ساتھ خاصی خوش لگ رہی تھی۔'' وہ تیکھے لہجے میں بولی۔ احسن بری طرح چونکا، کتنا مختلف لہجہ تھا آج حفصہ کا۔

''تو پھر.....؟'' اس نے کڑی نظروں سے حفصہ کو دیکھا۔

''میں نے یہ آپ کے لیے لیا تھا۔'' حفصہ نے ہاتھ آگے بڑھایا، اس کے ہاتھ میں ریڈ ریپر میں لپٹا بوکس تھا۔ احسن نے بوکس لے لیا، پھر وہیں کھڑے کھڑے انتہائی بدتہذیبی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بوکس کا ریپر پھاڑ دیا۔ اندر سے ایک چمکتی ہوئی قیمتی واچ نکلی تھی۔

''پیسے کہاں سے آئے تھے تمہارے پاس؟'' احسن نے بھویں سکیڑ کر ناگواری سے پوچھا، حفصہ کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔

''ممانی جان سے لیے تھے۔'' وہ بروقت بولی تھی، شرمندگی سے اس کی نظریں جھک گئی تھیں۔

''میری مما سے پیسے لے کر تم مجھے ہی گفٹ دے رہی ہو، کمال ہے.....'' وہ حقارت سے بولا۔

حفصہ کا چہرہ شرمندگی اور ذلت کے احساس سے سرخ پڑ گیا۔

''رکھ لیتا ہوں۔'' وہ جیسے احسان عظیم کرتے ہوئے بولا تھا۔ حفصہ کو لگا جیسے کسی نے بھرے بازار میں اس کے منہ پر جوتا دے مارا ہو، وہ بھاگتے ہوئے وہاں سے نکل کر اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔ اس رات وہ جاگتی رہی اور روتی رہی مگر حیرت انگیز طور پر صبح اس کا دل مکمل طور پر صاف ہو چکا تھا۔ وہ کوشش کے باوجود اس سے خفا نہیں ہو پائی تھی اور نہ اس کے خلاف سوچ پائی تھی۔ اگلی صبح اس نے یونیورسٹی کی تیاری کی اور ناشتے کے بغیر ہی باہر نکل آئی، پورچ میں آ کر اسے پتا چلا کہ اسے یونیورسٹی چھوڑنے والی گاڑی ورکشاپ میں تھی، وہ الٹے قدموں واپس لاؤنج میں آ گئی، ممانی جان نے اسے دیکھ لیا تھا۔

''ارے حفصہ بیٹا! گاڑی ورکشاپ میں ہے، جاؤ تم احسن کے ساتھ چلی جاؤ۔ احسن! تم حفصہ کو ڈراپ کر دو۔'' انہوں نے صوفے پر نیم دراز موبائل کے بٹنوں سے کھیلتے احسن کو مخاطب کیا۔

''سوری مما! میرے پاس ٹائم نہیں ہے۔'' وہ بے مروتی سے بولا۔

''غلط بات ہے، وہ کس کے ساتھ جائے گی؟'' انہوں نے تنبیہی انداز میں اسے ٹوکا۔

''یہ میری ذمے داری نہیں ہے۔'' وہ سر اٹھائے بغیر بولا۔ ''اسے کہیے کہ ڈرائیونگ سیکھ لے، کم از کم میں اس کا شوفر نہیں بن سکتا۔'' وہ بدلحاظی پہ اتر آیا۔

جانے کہاں سے ڈھیروں دھند حفصہ کی آنکھوں میں در آئی تھی، وہ لب کچلتی واپس پلٹ گئی۔ اس سے زیادہ سن کر اسے کرنا بھی کیا تھا۔ وہ شخص مسلسل اس کی انا کو پاؤں تلے کچلے جا رہا تھا، شاید اس کے نزدیک وہ کوئی عزت نفس اور ذاتی تکریم ہی نہ رکھتی تھی مگر اب.....! اب اور نہیں۔ حفصہ نے سوچ لیا کہ اب مزید وہ اسے اپنے ساتھ یہ تحقیرانہ سلوک روا رکھنے کی اجازت نہیں دے گی۔

☆☆☆

وہ ہینڈسم تھا، جوان تھا اور اسٹائلش بھی، مستزاد لائم لائٹ میں تھا، خوش قسمتی ہم قدم تھی اور دولت گویا بارش کی طرح برس رہی تھی۔ ایسے میں ناممکن ہی تھا کہ وہ اسکینڈلز کی زد میں نہ آتا۔

وہ ابتدائی نومبر کی ایک سرد صبح تھی جب ناشتے کی میز پر رضا حسین نے نیوز پیپر کا پلندہ اس کے سامنے پھینکا۔

''یہ سب.....کیا بکواس ہے احسن؟'' وہ ضبط کرتے کرتے بھی چلا اٹھے۔

''اس میں اتنا غصہ کرنے کی کیا بات ہے پاپا۔ یہ سب تو چلتا رہتا ہے۔'' اس نے چائے پیتے ہوئے اطمینان سے نیوز پیپر ایک طرف کر دیئے، رضا حسین کو جیسے آگ لگ گئی۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟ چلتا رہتا ہے.....کیوں؟ اسی لیے میں تمہیں منع کرتا تھا اس دلدل میں پیر رکھنے سے..... آخر کون ہے یہ سارہ؟ کیوں دیا اس نے یہ بیان کہ..... کہ تم دونوں شادی کرنے والے ہو؟'' وہ دہاڑ رہے تھے۔

حفصہ نے قدرے حیرت و رشک سے اس کے مطمئن انداز کو دیکھا، وہاں کوئی جلدی نہیں تھی، کوئی پریشانی نہیں تھی، اس کے لیے سب جیسے ایک معمول کا حصہ تھا۔

''پلیز.....چلائیے مت پاپا۔'' وہ ناگواری سے کپ رکھ کر اٹھ گیا۔

''کیوں نہ چلاؤں؟ میں باپ ہوں تمہارا۔ تم سے باز پرس کرنے کا حق رکھتا ہوں میں۔ مجھے سچ سچ بتاؤ آخر تم دونوں کے بیچ کیا چل رہا ہے؟'' وہ چنگھاڑتے ہوئے اس پر جھپٹے اور اس کے کندھے کو ہلکے سے جھنجوڑا۔

''ختم کیجیے یہ غصہ۔'' وہ غضبناک انداز میں ان کا ہاتھ جھٹک کر بلند آواز میں بولا۔

''یہ میری زندگی ہے میں جو چاہے کروں.....جیسے چاہوں کروں اور ان اخباروں کی

تو بات چھوڑ ہی دیں۔ یہ تو ہر ایک کو اسکینڈلائز کر دیتے ہیں، آپ ان سب پر یقین کر رہے ہیں۔ آپ کو اپنے بیٹے پر اعتبار نہیں ہے۔ خدا کے لیے مجھ پر ٹرسٹ کرنا سیکھیں۔'' آخر میں اس کا لہجہ التجائیہ ہو گیا۔

''تم پر اعتبار.....؟'' ''تم پر.....؟'' کیا خوب مذاق ہے۔'' وہ طنزیہ انداز میں بولے۔ وہ پیر پٹختا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ رضا حسین کرسی پر گر سے گئے۔

حفصہ نے تیز تیز گھونٹ بھرتے ہوئے چائے ختم کی اور باہر نکلی آئی، رضا حسین، عالیہ سے کہہ رہے تھے کہ ''انہیں اپنی ایکٹیوٹیز کم کر کے احسن پر توجہ دینی چاہئے۔'' وہ سر جھٹک کر آگے بڑھ آئی، ان چھ ماہ میں وہ احسن رضا کو کافی حد تک جان چکی تھی۔ وہ ایک ضدی، ہٹ دھرم اور مغرور انسان تھا، جو اتنا متکبر تھا کہ اپنے علاوہ اسے ہر شخص زمین پر رینگتا ہوا حقیر کیچوا ہی لگتا اور حفصہ کو تو وہ شاید اس سے بھی کم درجے پر رکھتا تھا۔ حفصہ کو حیرت ہوئی آخر اس شخص کی خود پرستی کی انتہا کیا تھی؟ اب اسے اپنی حماقت پر رونا آتا تھا، بھلا کیوں متاثر تھی وہ احسن رضا سے؟ تھا ہی کیا اس کے پاس؟ صرف اچھی شکل اور بے شمار دولت.....اور کیا.....؟ دنیا میں بے شمار لوگوں کے پاس دولت تھی، بے شمار لوگ احسن رضا سے بھی زیادہ ہینڈسم تھے۔ فی الوقت تو اس نے ساری توجہ اپنی اسٹڈیز کی طرف لگا دی تھی، اسے پڑھنا تھا، کچھ بننا تھا اور یہ اسی صورت ممکن تھا جب وہ ساری جان لڑا دیتی۔

زندگی یونہی گزرتی جا رہی تھی مگر وہ کوشش کے باوجود بھی اپنے دل کو سمجھانے اور سنبھالنے میں ناکام تھی، اسے یہ اعتراف کرنے میں کوئی عار نہ تھا کہ وہ احسن رضا سے محبت کرتی تھی۔ اس حقیقت کے باوجود کہ وہ اسے کوئی اہمیت نہیں دیتا تھا، اس کے باوجود کہ وہ اس کی نظر میں ردی بھر کی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ زندگی آگے بڑھتی جا رہی تھی اور مشکل کا کوئی حل نظر نہیں آتا تھا۔

☆☆☆

''احسن رضا'' ملک کی ٹاپ سلیبریٹی بن چکا تھا، ماڈلنگ اور ایکٹنگ دونوں فیلڈز میں اس نے اپنا لوہا منوا لیا تھا، اس کی کامیابیوں کا گراف دن بدن بڑھتا جا رہا تھا، فلم لائن سے وابستہ لوگ اسے فلم نگری میں دیکھنا چاہتے تھے مگر جانے کیا وجہ تھی کہ وہ فلم سائن کرنے سے گریزاں تھا۔ حالانکہ اب وہ کامیابی کے اس عروج پر تھا کہ اس کی کسی فیشن شو یا سیریل میں

موجودگی خود بخود شوکی کامیابی کی دلیل بن جاتی تھی۔

حفصہ کے فائنل ایگزامز نزدیک تھے، دو سال کا عرصہ جیسے پلک جھپکتے ہی گزر گیا تھا۔ احسن زیادہ تر لاہور اور کراچی میں ہی رہتا تھا، کبھی کبھار مہینوں بعد اس کی اسلام آباد آمد ہوتی تھی اور تب بھی وہ حفصہ سے عموماً ملے بغیر ہی چلا جاتا تھا، مگر اب حفصہ نے سوچ لیا تھا کہ وہ اسے ایک بار تو ضرور حال دل بتائے گی، پھر چاہے جو ہو.....؟ مگر اس کی نوبت ہی نہ آسکی۔ اس سے پہلے ہی اس پر یہ خبر بجلی بن کر گری کہ ''احسن رضا'' منگنی کر رہا ہے۔ ٹاپ ماڈل نور اشعر کے ساتھ اس کا اسکینڈل بہت عرصے سے منظر عام پر تھا مگر کوئی نہیں جانتا تھا کہ یہ تعلق اس نتیجے پر جا کر منتج ہوگا۔

اسی شام وہ ممانی جان کے کمرے کی طرف جا رہی تھی، جب اندر سے آتی آواز سن کر رک گئی۔ ''یہ تو احسن کی آواز ہے، یہ کب آیا.....؟'' حفصہ نے حیرانی سے سوچا۔ وہ غصے سے بہت بلند آواز میں بول رہا تھا۔

''آپ نے ایسا سوچا بھی کیسے مما؟''

''کیوں کیا کمی ہے اس میں؟ ہزاروں سے بہتر ہے، نیک گھریلو سی بچی ہے اور یاد رکھو احسن! یہ تمہارے باپ کا فیصلہ ہے۔'' عالیہ کی آواز آئی۔

''نیک گھریلو..... مائی فٹ، میری بات سنیں مما، اگر حفصہ طاہر اس دنیا کی آخری لڑکی بھی ہو تب بھی میں اس سے ہرگز ہرگز شادی نہیں کروں گا اور مائنڈ اٹ شادی مجھے کرنی ہے پاپا کو نہیں۔ اس لیے مہربانی کر کے وہ اپنے فیصلے اپنے پاس رکھیں۔ یقیناً میں اس بات کا بہتر فیصلہ کر سکتا ہوں کہ میرے لیے کیا بہتر ہے؟'' وہ بلند آواز میں کہہ رہا تھا۔

حفصہ کے سر پر بم پھٹا تھا، وہ اپنی جگہ سے ہل نہیں سکیں۔

''آپ نے ایسا سوچا بھی کیسے؟ حلیہ دیکھا ہے آپ نے اس کا۔ چار لوگوں کے درمیان اٹھنے بیٹھنے کا اسے پتا نہیں۔ وہ میرے سرکل میں کیسے موو کر سکے گی؟ اور مما آپ؟ اگر آپ کے ذہن میں بھی اسے لے کر کوئی ایسا خیال موجود ہے تو پلیز..... اسے ابھی نکال دیں..... مائی گاڈ وہ..... ملانی..... حفصہ..... نہیں ہرگز نہیں مما۔'' وہ تن فن کرتا کمرے سے نکلا اور ناک کی سیدھ میں چلتا کاری ڈور پار کر گیا۔ وہ ساکت کھڑی تھی۔

رات آہستہ آہستہ بیت رہی تھی اور وہ ایک فیصلے پر پہنچ چکی تھی، اسے کم از کم ایک بار

تو احسن سے بات کرنی چاہیے۔ کیا پتا وہ مان جائے؟ یہی سوچ کر وہ اس کے کمرے کی طرف بڑھ آئی تھی۔ آہستہ سے دستک دی اور ''یس'' کی آواز سننے کے بعد وہ اندر داخل ہوگئی، وہ موبائل پر بزی تھا۔

''مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔'' اس نے سر جھکا کر خشک لبوں کو باہم بھینچتے ہوئے کہا۔

''کرو.....'' اس نے نگاہ ہٹائے بغیر کہا۔

''میں..... میں آپ سے محبت کرتی ہوں احسن۔'' اسنے گویا اعتراف جرم کیا۔

''تو.....؟'' وہاں کوئی حیرانی نہیں تھی یوں جیسے وہ پہلے سے ہی جانتا تھا۔

''آپ مجھے ریجیکٹ کیسے کر سکتے ہیں؟'' حفصہ کی آنکھوں میں جیسے ڈھیروں پانی اتر آیا تھا۔

اس بار اس نے باقاعدہ سر اٹھا کر اسے دیکھا اور اس کی آنکھوں میں حیرانی چمکی تھی۔

''میں ایک آزاد ملک کا آزاد شہری ہوں اور میرے پاس یقیناً یہ اختیار ہے کہ میں اپنی پسند کا لائف پارٹنر چوز کر سکوں..... سو..... میں نے تمہیں ریجیکٹ کر دیا۔'' وہ اسی سکون سے بولا جو اس کی طبیعت کا خاصا تھا۔

حفصہ کے اندر گویا آتش فشاں پھٹنے لگے۔

''لیکن..... میں آپ سے محبت کرتی ہوں۔'' اس کے آنسو گالوں پر لڑھک آئے تھے۔

''تم یہاں کیا کرنے آئی تھیں، میرے خیال میں پڑھنے..... رائٹ..... تو میرا خیال ہے تمہیں سارا دھیان اپنی اسٹڈیز کی طرف دینا چاہئے، اب جا سکتی ہو۔'' وہ دوٹوک انداز میں بولا۔ وہ یکلخت پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

''آپ میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتے احسن، آپ یہ مت کہیں کہ آپ مجھ سے محبت نہیں کرتے۔ آپ تو یہ مت کہیں..... میں مر جاؤں گی احسن! میں آپ کے بغیر مر جاؤں گی۔'' وہ گھٹنوں کے بل زمین پہ گری سسک رہی تھی۔

احسن دم بخود اس کے سامنے کھڑا تھا۔

''اپنی بکواس بند کرو۔ تمہیں شرم آنی چاہئے مجھ سے اس قسم کی باتیں کرتے ہوئے۔ ہو کیا تم؟ ذرا شکل دیکھو اپنی۔ کیا تم اس قابل ہو کہ کوئی تم سے محبت کرے، دفع ہو جاؤ یہاں سے..... اپنی اوقات دیکھو اور اپنے کرتوت دیکھو۔ کیا تمہاری ماں نے تمہیں ''محبت'' کرنے بھیجا

تھا یہاں..... دفع ہو جاؤ یہاں سے.....'' اس نے حفصہ کو کلائی سے پکڑ کر گھسیٹا اور کمرے سے باہر نکال دیا۔

وہ دوڑتی ہوئی اپنے کمرے میں آئی تھی، دروازہ بند کر کے وہ دروازے سے ٹیک لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔ کتنی بے رحمی اور سفاکی سے اس نے حفصہ طاہر کو اس کی اوقات بتا دی تھی۔ وہ روتے روتے اٹھی اور آئینے کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔

کمرے کے سناٹے میں اس کی دھیمی سسکیاں ارتعاش پیدا کر رہی تھیں۔

☆☆☆

بہت سارے دن گزر گئے، اس کے فائنل ایگزامز ہو گئے، وہ خاموشی سے اپنا سامان باندھ چکی تھی، واپس تو جانا ہی تھا۔ مگر ممانی جان نے اسے روک لیا۔ وہ چاہتی تھیں کہ وہ کم از کم احسن کی انگیجمنٹ تک ادھر ہی رکے۔ وہ جیسے خود پہ ہنستی رک بھی گئی، جیسے خود کو یہ یقین دلانا مقصود تھا کہ ہاں! وہ اس شخص کے قطعی قابل نہ تھی۔ اس کی انگیجمنٹ کے دن وہ لان کے تاریک کونے میں دبکی سارے عمل کو جیسے میکانکی بے حسی سے دیکھتی رہی، لیکن اندر ہی اندر پکتا لاوا ایک جنون کی شکل اختیار کر چکا تھا۔

''میں تمہیں بتاؤں گی احسن رضا! کہ میری اوقات کیا؟ میں تمہیں بتاؤں گی کہ عورت کی انا پہ پاؤں رکھنے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ میں تمہیں بتاؤں گی کہ تریاہٹ کا کیا انجام ہوتا ہے۔''

''تم انتظار کرنا..... اور دعا کرنا تب..... تب..... تمہارا مجھ سے سامنا نہ ہو۔''

اس نے آہستگی سے سامنے دھری نوٹ بک بند کی اور سر ٹیبل پر ٹکا دیا۔ وقت کتنی جلدی بیت جاتا ہے۔ پتا بھی نہ چلا کب پانچ سال بیتے۔ اسے یاد تھا کہ وہ اس گھر سے یہ عہد کر کے نکلی تھی کہ اسے کچھ بننا تھا۔ کم از کم کچھ ایسا تو ضرور کرنا تھا کہ وہ احسن رضا کو نیچا دکھا سکے۔ اسے بتا سکے کہ عورت جب انا کی بازی کھیلتی ہے تو محبت اور دل نامی نازک اشیاء اور جذبات کو بہت پیچھے چھوڑ دیتی ہے۔

وہاں سے واپس گھر آنے کی بجائے اس نے لاہور ہوسٹل میں رہائش اختیار کی تھی، اس کے ساتھ ہی اسے اپنی ایک متمول دوست کے توسط سے ایک مقامی نجی چینل پر نیوز کاسٹر کی جاب مل گئی تھی، اگرچہ اس کے پاس تجربہ نہیں تھا مگر اچھی آواز اور بہتر لب ولہجہ تھا اور سب سے بڑھ کر سفارش تگڑی تھی جس کے بل پر اسے بڑی آسانی سے جاب مل گئی تھی، شاید اس کی وجہ یہ

بھی تھی کہ اس مقامی نیوز چینل کی شہرت ابھی کم تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے ایوننگ کلاسز میں پولیٹیکل سائنس میں ماسٹرز کے لیے ایڈمیشن لے لیا تھا، اپنے دبے ہوئے اعتماد سے خالی لہجے اور انداز کو اس نے اتار کر دور پھینکا تھا، اسے شروع میں خاصی مشکل ہوئی تھی مگر ایک جنونی کیفیت اسے اپنے ساتھ بھگائے جاتی تھی۔ سیلری اس کی اتنی تھی کہ بڑے آرام سے ہوسٹل کے اخراجات پورے ہو جاتے تھے۔ احسن کے بارے میں اسے اماں اور ممانی جان سے پتا چلتا رہتا تھا۔ وہ اس کے بارے میں مکمل طور پر اپ ڈیٹ رہتی تھی، یہ شاید اس کی مجبوری بھی تھی۔

وقت تیزی سے سرکا، جیسے ہی اس کا دوسرا ماسٹر ختم ہوا اس کے ساتھ ہی اسے ایک معروف نجی چینل سے مارننگ کی نشریات کی آفر آ گئی، اس نے بلا توقف قبول کر لی، اگرچہ اب وہ اپنی پرانی جاب میں بہت اچھی طرح سے سیٹ ہو چکی تھی اور ایک بار پھر نئے سرے سے، نئے سیٹ اپ کا حصہ بننا خاصا مشکل تو نہیں، البتہ کچھ مشکل ضرور تھا، مگر اسے آگے بڑھنا تھا، چند دن لگتے مگر پھر وہ ایڈجسٹ کر ہی جاتی۔

اس کا مارننگ شو، اس کی توقع سے زیادہ کامیاب ہوا تھا۔ ''عباد'' سے اس کی ملاقات یہیں ہوئی تھی وہ ''ہوم منسٹری'' میں تھا اور حفصہ نے اسے انٹرویو کے لیے مدعو کیا تھا۔ اس کے بعد وہ اکثر اسے فون کرنے لگا، کبھی کبھار کہیں ملاقات بھی ہو جاتی۔ ابتدائی دو تین ملاقاتوں میں ہی عباد نے کھل کر اپنا مقصد واضح کر دیا تھا مگر یہ حفصہ ہی تھی جو کسی طور پر راہ بدلنے کو تیار نہ تھی۔ دونوں کا تعلق دوستی سے کہیں بڑھ کر مضبوط تھا اور عباد کبھی کبھار جھنجلا جاتا۔ پتا نہیں، اسے کیا پریشانی تھی؟ پتا نہیں وہ کیا چاہتی تھی؟ اور پتا نہیں اسے کب ماننا تھا؟ ایسا نہیں تھا کہ وہ اس انتظار سے اکتا گیا تھا یا تھک گیا تھا مگر کبھی کبھی فطری طور پر جھلا سا جاتا۔ اسے یہ انتظار بہت کڑا لگتا..... مگر پھر امید اسے اپنی سمت کھینچنے لگتی اور وہ آنکھیں بند کیے اس امید کے سرے کو تھامے آگے بڑھتا جاتا۔

اور اب اس نے عباد کو چند دن انتظار کرنے کو کہا تھا۔ جانے کیوں عباد کو یقین تھا کہ اس بار وہ لازماً کوئی فیصلہ کر لے گی۔

☆☆☆

کافی عرصے سے ان کے چینل کے ڈائریکٹر کی کوشش تھی کہ وہ ''احسن رضا'' کو انٹرویو کے لیے مدعو کر سکیں، اس کے لیے کافی عرصے سے وہ کوشش کرتے رہے تھے، بے شمار اپائنٹمنٹس

لی گئی، رد ہو گئیں، پھر لی گئیں، تب کہیں جا کر وہ آمادہ ہوا تھا۔ حفصہ نے کافی عرصے سے اس انٹرویو کی تیاری کر رکھی تھی، جس دن وہ اس کے پروگرام میں مدعو تھا، اس دن اس نے اپنی تیاری بطور خاص کی تھی، وہ اس کے سامنے مضبوط نظر آنا چاہتی تھی، وہ اسے حیران کر دینا چاہتی تھی، وہ اسے ہرا دینا چاہتی تھی۔

اور سب کچھ اس کی توقع کے مطابق ہوا، وہ اسے دیکھ کر شاکڈ رہ گیا تھا، حفصہ نے اس کو بہت خوب صورت سے جال میں لپیٹا تھا، اس کے مربوط اور پاور فل سوالات، ثبوتوں اور حوالوں کے جواب میں وہ صرف بغلیں جھانک کر رہ گیا تھا، حفصہ نے اس کی پوری زندگی کا کچا چھٹا کھول کر رکھ دیا تھا، اس نے احسن کے بچپن سے لے کر جوانی تک کی روداد دلچسپیاں، افیئرز غرض ہر چیز بڑے تفصیلی انداز میں ڈسکس کی تھی، نور اشعر سے اس کے بریک اپ کو خصوصی طور پر اہمیت دی تھی اور سب سے بڑا پرابلم تو یہ تھا کوشو براہ راست چل رہا تھا، وہ نہ تو چھوڑ کر جا سکتا تھا اور نہ کچھ کہہ سکنے کی پوزیشن میں تھا۔ نتیجتاً وہ صرف ضبط کر سکتا تھا اور کرتا رہا تھا، حفصہ کو اس کی حالت دیکھ کر جیسے اندر ٹھنڈسی پڑ گئی تھی۔

اسے یوں اپنے سامنے نروس دیکھ کر اس کا سیروں خون بڑھ گیا تھا۔ انٹرویو کے اختتام تک احسن کی حالت دیکھنے والی تھی۔ وہ کھونٹے سے بندھے جانور کی مانند بے بس تھا یا شاید پنجرے میں بند شیر کی مانند..... اس کی بے بسی دیکھ کر حفصہ کے لبوں پر مستقل ایک زہریلی مسکراہٹ کھیلتی رہی تھی۔ کیوں نہ ہوتی؟ یہی شخص تو تھا جس نے اس کی ذات کی دھجیاں اڑا دی تھیں۔ یہی شخص تو تھا جس نے اس کی انا کو اپنے پیروں تلے کچل ڈالا تھا۔ وہ اسے کیسے معاف کر دیتی؟ وہ اسے قطعاً معاف نہیں کر سکتی تھیں۔ آج اس نے احسن رضا کو ہیرو سے زیرو بنا دیا تھا اور اس کے انٹرویو کو ایک گوسپ۔

''احسن رضا'' اسی شام لاہور سے پہلی فلائٹ میں اسلام آباد آیا تھا، عالیہ سے اس نے حفصہ کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل کی تھیں اور اسے یہ جان کر شاک لگا تھا کہ وہ گزشتہ کئی سالوں سے لاہور میں تھی، اس نے وہاں اپنا گھر لے لیا تھا اور اپنی اماں کو بھی وہاں لے گئی تھی۔ وہ بے حد حیران تھا، تو گویا واقعہ اور حادثہ اچانک نہیں تھا بلکہ یقیناً سب کچھ پہلے ہی سے طے شدہ تھا۔ وہ بس حیران تھا، لیکن سب سے زیادہ حیران کن وہ کشش وہ خوبصورتی تھی جو اسے حفصہ طاہر میں محسوس ہو رہی تھی۔ جب وہ واپس لاہور آیا تو دل میں ایک فیصلہ کر چکا تھا۔

یہ ایک اتفاق ہی تھا کہ وہ اسے مال روڈ کے کنارے اپنی گاڑی کے قریب کھڑی نظر آ گئی۔ اس کے چہرے پر جھنجلاہٹ تھی اور وہ موبائل پر کوئی نمبر پش کر رہی تھی۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے فون پر مختصر سی بات کی اور فون بند کر کے منتظر نظروں سے سڑک کی طرف دیکھنے لگی۔ لازمی بات تھی کہ اس کی گاڑی کوئی پرابلم کر رہی تھی۔ احسن نے اس کے قریب گاڑی روک کر شیشہ نیچے کیا۔

وہ اسے دیکھ کر بڑی سے تیزی سے چونکی اور اس کے تاثرات میں بڑی واضح تبدیلی نظر آئی تھی۔

''آئی تھینک تمہاری گاڑی پرابلم کر رہی ہے۔'' اس نے کہا۔

''یہ آپ کا دردسر نہیں۔'' وہ سرد مہری سے کہہ کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔

''تمہیں کہاں جانا ہے؟ میں تمہیں چھوڑ دیتا ہوں۔''

''ڈونٹ ٹیل می..... مسٹر احسن! آپ میرے شوفر نہیں ہیں۔'' وہ طنزیہ کہتی ایک قدم مزید پیچھے ہٹ گئی۔

بہت پرانی بات یکلخت احسن کے حافظے میں چمکی، بالکل اسی طرح، ان ہی الفاظ میں ایک بار اس نے عالیہ کے سامنے حفصہ کو بے عزت کیا تھا اور آج..... اس نے بدلا پورا کر دیا تھا۔ تذلیل کے احساس سے احسن کا چہرہ تپ اٹھا۔ اس نے تیزی سے گاڑی آگے بڑھائی تھی۔ ٹائر چرچرائے اور گاڑی زن سے آگے بڑھ گئی۔

☆☆☆

وہ اس وقت نیو اسٹار ایوارڈ کی تقریب میں تھا، ہر طرف رنگا رنگ زرق، برق ملبوسات میں لہراتی پریاں تھیں، مہذب آواز میں بولتے سوٹوں میں ملبوس مرد تھے، غرض ایک رنگا رنگ تقریب تھی، وہ ہاتھ میں مشروب تھامے سب سے معذرت کرتا کوئی پرسکون کونا ڈھونڈ رہا تھا جب اسے نسبتاً داہنی طرف والی ٹیبل پر حفصہ طاہر نظر آئی، وہ بے اختیار چونکا وہ کسی سے محو گفتگو تھی، وہ تیزی سے اس طرف بڑھا۔

''ایکسکیوز می.....! مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔'' اس نے حفصہ کو شائستگی سے مخاطب کیا۔ اس کی ساتھی خاتون نے مسکرا کر اسے دیکھا اور دوسری طرف بڑھ گئی۔ وہ اس کے سامنے ٹیبل پر ٹک گیا۔ حفصہ کی نگاہوں میں تیرتی ناپسندیدگی گہری ہو گئی تھی۔

''فرمائیے.....'' حفصہ نے لٹھ مار انداز میں کہا۔ ''اتنی جلدی بھی کیا ہے؟'' وہ معنی خیز

انداز میں مسکرایا۔

''مگر مجھے ہے.....'' وہ تیزی سے بولی۔ جواباً وہ گہری نظروں سے اس کا جائزہ لینے لگا، وہ اس وقت سفید لانگ شرٹ اور ٹراؤزر میں ملبوس تھی جس میں اس کی خوبصورتی کچھ مزید بڑھ گئی تھی۔ اس کی خاموشی سے اکتا کر وہ اٹھنے لگی۔ اسی وقت احسن نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ حفصہ کو جیسے کرنٹ لگا۔

''میرا ہاتھ چھوڑو.....'' وہ غرا اٹھی۔

''اگر نہ چھوڑوں تو.....؟'' وہ جیسے حظ لیتا ہوا بولا۔

''تم ضرور چھوڑو گے کیونکہ یہ تمہارے باپ کا گھر نہیں ہے اور نہ ہی یہاں تم کوئی رومانٹک سین شوٹ کروا رہے ہو.....اور نہ ہی میں تمہارے ساتھ ڈیٹ پر آئی ہوں، سمجھے.....'' وہ طیش سے بول رہی تھی، سارا ادب لحاظ بالائے طاق رکھتے ہوئے۔ ''میرے ایک اشارے پر سارا پریس اور میڈیا اکٹھا ہو جائے گا اور پھر تمہارا کیا حشر ہوگا یقیناً تم جانتے ہی ہو گے۔'' وہ زہر اگل رہی تھی۔

احسن کو ایک دم اپنی کمزور پوزیشن کا اندازہ ہوا اس نے آہستگی سے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ وہ فاتحانہ انداز میں مسکرائی اور اپنی نشست سے ٹیک لگا لی۔

''ٹھیک ہے، اب تم اپنی بات کر سکتے ہو۔''

''میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔'' وہ بڑے سکون سے بولا۔

حفصہ نے سپاٹ انداز میں اسے دیکھا.....یوں جیسے پہلے سے ہی جانتی تھی۔

''کیوں.....؟''

''کیوں.....؟ کیا مطلب کیوں.....؟'' وہ حیران ہوا۔

''وہی تو.....آخر راتوں رات مجھ میں ایسی کون سی خوبیاں پیدا ہو گئی ہیں جو تم مجھ سے شادی کرنے پر تیار ہو گئے؟'' وہ طنزیہ ہنسی۔

''تم مجھے اچھی لگی ہو.....''

''گڈ.....اب اچھی لگی ہوں، پہلے تو بہت بری لگتی تھی نا؟'' وہ اب بھی مسکرا رہی تھی۔

''میں تم سے محبت کرتا ہوں۔'' وہ تیزی سے بولا۔

حفصہ بے اختیار کھلکھلا کر ہنس دی جیسے کوئی لطیفہ سن لیا ہو۔

''ڈونٹ ٹیل می.....احسن رضا! کیسی محبت؟ کیا وہ محبت جو تم اپنی ہر کو اسٹار سے کرتے ہو یا پھر وہ محبتیں جن کے اسکینڈلز آئے دن چھپتے رہتے ہیں؟ کون سی محبت؟ کیا تم بتانا پسند کرو گے؟'' وہ مذاق اڑاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''تم بھی.....تو مجھ سے محبت کرتی ہو نا حفصہ.....'' وہ یقین سے کہہ رہا تھا۔

حفصہ کی آنکھوں سے آنچ نکلنے لگی، اس کی مسکراہٹ سمٹ گئی۔

''غلط.....بالکل غلط.....میں نے کبھی تم سے محبت نہیں کی۔ وہ صرف میری انسپائریشن تھی جسے میں نے محبت سمجھ لیا تھا۔ بہت متاثر تھی میں تمہاری دولت، تمہارے غرور سے اور شاید سب سے بڑھ کر تمہاری خوبصورتی سے، مگر.....ایک چہرے پہ کئی چہرے سجا لیتے ہیں لوگ۔ تمہارا اصلی اور گھناؤنا چہرہ تو میں نے اسی روز دیکھ لیا تھا احسن رضا! تم جیسا شخص جو ماں باپ کو تھرڈ پرسن سمجھتا ہے وہ کسی سے کیا محبت کر سکتا ہے؟ کبھی نہیں.....'' وہ نفرت سے کہہ رہی تھی۔

''تم مجھے غلط سمجھ رہی ہو۔'' وہ فوراً بولا۔

''نہ صحیح اور نہ غلط.....میں تمہیں ''کچھ نہیں'' سمجھ رہی۔'' اس نے ''کچھ نہیں'' پر زور دیا۔

وہ پھیکے چہرے کے ساتھ اسے دیکھتا رہا۔

''لیکن کیوں.....؟'' وہ لب بھینچتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

''میں تمہیں وجہ بتانا پسند نہیں کرتی۔'' وہ بے نیازی سے بولی اور اٹھ گئی۔ احسن کے دل پر کڑی گزر گئی۔ مگر وہ خود کو سنبھال کر کمینگی سے مسکرایا تھا۔

''تو ٹھیک ہے میں مما کو بھیجوں گا، پھپھو کے پاس اپنا پرپوزل دے کر اور وہ اتنی بامروت اور احسان مند تو ضرور ہیں ہماری کہ کسی قیمت پر مجھے ریجیکٹ نہیں کریں گی۔''

وہ اس کی بات سن کر پھر بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے کے تاثرات یکلخت بہت عجیب سے ہو گئے تھے۔

''تم نے مجھے مجبور کر دیا ہے میں تمہیں تمہاری ''اوقات'' دکھا دوں تو سب سے پہلی بات تو یہ ہے احسن رضا کہ میں آل ریڈی انگیجڈ ہوں۔'' وہ سکون سے بولی۔ احسن کو جھٹکا لگا۔

''تم جھوٹ بول رہی ہو۔'' وہ بے ساختہ بولا۔

''تم مت مانو.....مجھے فرق نہیں پڑتا۔'' اس نے شانے جھٹکے۔

''کون ہے وہ؟ کیا یہ تمہاری پسند کی شادی ہے؟'' وہ بے یقینی سے اسے دیکھتا پوچھ رہا تھا۔

''عباد مصطفیٰ'' ہے وہ اور دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ ہاں اس میں میری پسند شامل ہے۔'' وہ اطمینان سے بولی تھی۔

احسن رضا کا سارا اطمینان رخصت ہو گیا تھا۔

''ایسی کون سی بات ہے اس میں، جو مجھ میں نہیں ہے۔'' وہ چبھتے ہوئے لہجے میں بولا۔

''تم میں تو کوئی ایسی بات ہے ہی نہیں جو ''اس'' میں ہے۔'' وہ طنزیہ ہنسی۔

''کیوں کیا کمی ہے مجھ میں؟'' وہ غرا ہی تو اٹھا تھا۔

''تمہارے پاس ہے ہی کیا؟ صرف اچھی شکل اور دولت.....اور بس۔ خود ہی بتاؤ اور کچھ ہے تمہارے پاس؟ اور معذرت کے ساتھ میں ان لڑکیوں کی صف سے نکل آئی ہوں جو تمہاری فینز میں شامل ہیں۔ کیا تمہارے پاس اچھا کردار ہے؟ نہیں۔ کیا تمہارا پاس تعلیم ہے؟ نہیں۔ آج تم شوبز میں ہو، کتنا کیریئر ہے تمہارا؟ پانچ سال یا زیادہ سے زیادہ دس سال اور بس.....؟ اور اگر میں بات کروں عباد کی تو تمہارا اور اس کا کوئی مقابلہ ہی نہیں ہے، وہ ''ہوم منسٹری'' میں ہے۔ لہٰذا اس کا مستقبل تو ساٹھ سال بعد ختم ہوگا اور اس کا کردار تم سے کہیں مضبوط اور خوبصورت ہے اور تعلیم میں تو اس کا تم سے کوئی مقابلہ ہی نہیں۔ ہاں البتہ تمہیں دولت میں کچھ سبقت ضرور حاصل ہے لیکن احسن رضا! دولت کبھی بھی میری ترجیحات میں شامل نہیں رہی۔ مجھے امید کہ تمہاری تسلی ہو گئی ہوگی اور آئندہ میرے راستے میں آنے کی کوشش مت کرنا ورنہ مجھے تمہاری یادداشت ٹھیک کرنے میں زیادہ وقت نہیں لگے گا۔'' وہ ایک ایک کر کے اس کی ذات کے پرخچے اڑاتی گئی۔

احسن رضا فق چہرے کے ساتھ اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ مستحکم قدموں سے وہاں سے دور ہٹتی چلی گئی تھی۔

☆☆☆

ایک مکمل پرسکون اور خوبصورت نیند لے کر وہ اٹھی تو خود کو بہت مطمئن اور تازہ دم محسوس کر رہی تھی۔ کمبل ایک طرف پھینکتے ہوئے اس نے سائیڈ ٹیبل پر دھرا سیل فون اٹھایا۔ ''عباد کا نمبر'' جگمگا رہا تھا۔

''گڈ مارننگ.....'' وہ مسکرا کر بولی۔

''مارننگ.....تم سچ کہہ رہی ہو ناں حفص! ایسا نہ ہو شام تک تمہارا ارادہ بدل جائے؟'' وہ مشکوک ہو رہا تھا۔ حفصہ کھل کر ہنس دی۔

''نہیں ایسا نہیں ہے، میں فیصلہ کر چکی ہوں۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولی۔

''تھینک گاڈ.....اوکے.....شام میں ملتے ہیں۔'' وہ سرشاری سے مسکرایا تھا۔

''اوکے.....'' حفصہ نے فون بند کر دیا۔ اس کے چہرے پر گہری سوچ کی پرچھائیاں تھیں۔

شام میں وہ نک سک سا تیار اس کے سامنے تھا۔ ادھر ادھر کی بے شمار باتیں کرنے کے بعد وہ اسے رنگ دکھانے لگا جو وہ اس کے لیے لایا تھا، پھر اسے رنگ پہنانے کے بعد بہت دیر تک وہ اس کے ہاتھ کو دیکھتا رہا تھا۔

''ایک بات پوچھوں عباد.....؟''

وہ حفصہ کی آواز پر چونکا۔

''کون سی بات.....؟''

''کیا کبھی کسی نے تمہاری انا کو چیلنج کیا؟'' وہ سنجیدگی سے پوچھ رہی تھی۔

وہ چونک گیا۔ پھر توقف سے بولا۔

''ہاں.....تم نے۔''

''کیا؟ میں نے.....؟'' وہ حیرت سے چلا پڑی، پھر اردگرد کی میزوں پر بیٹھے افراد کو دیکھ کر دانستہ آواز دھیمی کر لی تھی۔

''مطلب کیا ہے تمہارا.....؟''

''سچ تو یہ ہے کہ حفصہ کہ میں ہمیشہ سوچا کرتا تھا کہ یار! یہ لڑکی آخر مجھ سے چاہتی کیا ہے؟ نہ پرپوز کرنے دیتی ہے نہ گھر آنے کی اجازت دیتی ہے؟ دو سال سے جانتا ہوں تمہیں اور یہ دو سال..... ہاں پورے دو سال تم نے میری انا پر پاؤں رکھے گزارے ہیں، حفصہ کبھی کبھی تو میں جھلا جاتا کہ آخر مجھ میں کمی کیا ہے جو یہ یوں مجھے پرکھنے میں اتنا وقت لے رہی ہے؟ مگر جانتی ہو ہمیشہ ایک سوچ، ایک امید مجھے اپنے ساتھ لیے جاتی۔''

''آپ کو اپنی انا کے کچھ رنگ کھونا پڑتے ہیں۔'' دونوں کا بے اختیار قہقہہ گونج اٹھا۔

حفصہ خوش تھی اور بہت مطمئن تھی کہ اس کے حصے میں جو شخص آیا تھا وہ انا پرست نہیں تھا۔ نہ خود پسند بلکہ وہ تو بہت ٹھنڈے مزاج کا تھا، وہ تو بہت قابل عزت تھا یقیناً اللہ نے اسے اسی کے لیے بنایا تھا، جبھی اس کی قسمت میں اتنا خوب صورت شخص لکھا تھا۔ وہ دل سے اپنے رب کی شکرگزار ہو گئی تھی۔

.....

مجھے مکمل کردو

بورڈ آف ڈائریکٹرز کی میٹنگ جاری تھی، روم کی خاموشی کو دروازہ کھلنے کی آواز نے توڑا۔

''رومان لاشاری'' نے قدرے ناپسندیدہ نظروں سے پنسل انگلیوں میں گھماتے ہوئے کھلنے والے دروازے کو دیکھا۔

آنے والا ''حسان احمد'' تھا، اس کا سب سے عزیز دوست اور بزنس پارٹنر۔

رومان کی پیشانی بے اختیار شکن آلود ہوگئی، اسے یہ بے جا مداخلت بے حد بری لگی تھی، حسان کے چہرے پر اضطراب تھا، اس نے تیز قدموں سے اپنے اور رومان کے درمیان موجود فاصلہ کم کیا اور اس کے قریب آکر قدرے جھک گیا۔

''میٹنگ پوسٹ پون کرو رومان! اٹس ارجنٹ۔'' اس نے تیز لہجے میں کہا، رومان نے قدرالجھ کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''ریزن؟'' اس نے سرد مہری سے کہا۔

حسان نے مدھم لہجے میں کچھ کہا، رومان کے چہرے کا رنگ تیزی سے بدلا تھا اس کے ہاتھ سے پنسل میکانکی انداز میں چھوٹ گئی، حسان اب اس کے لیپ ٹاپ کی LID گرا رہا تھا، رومان تیزی سے کھڑا ہوگیا۔

''آئی ایم سوری جنٹل مین، میٹنگ از پوسٹ پون، آئی شیل اناؤنس دا نیکسٹ ڈیٹ۔''

اس نے متغیر تاثرات سمیت کہا اور تیز قدموں سے باہر کی طرف مڑ گیا۔

حسان اس کا لیپ ٹاپ اٹھائے اس کے پیچھے لپکا تھا، لیکن جب تک وہ اسے رومان

کے روم میں رکھ کر لوٹا، رومان پارکنگ سے گاڑی نکال چکا تھا، وہ تیر کی مانند پیچھے بھاگا تھا مگر جب تک وہ گاڑی کے قریب پہنچا، گاڑی زن سے نکلی اور پارکنگ لاٹ کا فرش ٹائروں کی چرچراہٹ سے گونج اٹھا۔

☆☆☆

آپ سے مل کر ہم کچھ بدل سے گئے
شعر کہنے لگے، گنگنانے لگے

اس نے مگن سے انداز میں گنگناتے ہوئے برتنوں کی ٹوکری اٹھائی اور سلیب پہ رکھ دی۔

پہلے مشہور تھی اپنی سنجیدگی!!!
اب تو جب دیکھیے مسکرانے لگے

ایک مختصر وقفے کے بعد وہ پھر سے شروع ہو چکی تھی، ہاتھ تیزی سے برتنوں کو مطلوبہ جگہوں پر رکھنے میں مگن تھے، جب امان کی پاٹ دار آواز پہ وہ اچھل پڑی۔

''بس کر منحوس، بند کر لے اپنا باجا، ہر وقت گانے بجانے کی پڑی رہتی ہے تجھے، مجھے تو ڈر ہے کسی دن لوگ آکر مجھ سے پوچھنے نہ لگیں کہ میں نے گھر میں میراثن کب سے رکھ لی؟'' وہ لتاڑ رہی تھیں۔

وہ ان سنی کرتے ہوئے اپنے کام میں مصروف رہی، البتہ باجا واقعی بند ہو چکا تھا۔

''ویسے آپ کب آئیں؟'' اس کے اتنے معصوم سوال اور غیر متعلق انداز نے انہیں پتنگے لگا دیئے۔

''تجھے اعتراض کس بات پہ ہے؟ میرے گھر آنے پر؟ یا اتنی جلدی آنے پر؟'' انہوں نے کمر پر ہاتھ رکھ کر اسے گھورا۔

''دونوں پر۔'' وہ زور سے ہنس پڑی، امان نے بے ساختہ دو ہتھڑ اس کے شانے پر رسید کیا۔

''بے حیا! ماں سے مذاق کرتی ہے۔'' وہ طیش میں آگئیں، وہ اسی طرح مسکراتے ہوئے ان کے پاس بیٹھ گئی۔

''اچھا، چھوڑیں اس بات کو، آپ تو ارم کے سسرال گئی تھیں ناں کیا بات ہوئی؟'' اس نے سنجیدگی سے ان کا دھیان ہٹایا، وہ تھکے ہوئے انداز میں موڑھے پہ بیٹھ گئیں۔

''کچھ نہیں، بننا کیا ہے، وہ تاریخ مانگ رہے ہیں، حق پہ ہیں وہ بھی، بھلا کب تک انتظار کریں، دو سال ہونے کو آئے منگنی ہوئے، آج کل کون کرتا ہے اتنا انتظار، ہکے.....ہا..... سوچا تھا جو جمع جتھا ہے ایک ہی بار لگا دوں گی، تیرا بھی ساتھ ہی کروں گی۔'' ان کے لہجے میں پریشانی اور حسرت تھی، وہ نا چاہتے ہوئے بھی چوری ہو گئی۔

''خیر جو میرے رب کی رضا، ہم تو اسی میں راضی ہیں۔'' وہ آہ بھرتے ہوئے بولیں اور گھٹنوں پہ زور دیتے ہوئے اٹھ گئیں۔

وہ خاموشی سے بیٹھی رہی، چھوٹے سے برآمدے کے آگے کچا صحن تھا جس کا فرش تقریباً اکھڑا ہوا تھا، آٹھ فٹ کی دیوار کی جڑ میں بنی کیاریاں تین چار قسموں کے پھولوں سے بھری ہوئی تھیں جن میں سب سے زیادہ نمایاں سدا بہار اور موتیے کے پھول تھے البتہ کہیں کہیں سرخ گلاب اور گل لالہ بھی جھلک دکھا رہے تھے۔

وہ گل لالہ کی آتشیں خوبصورتی پہ نگاہ جمائے اندر اٹھتے طوفانوں سے نبرد آزما تھی جب دروازہ کھول کر ارم اندر آئی تھی، سیاہ چادر میں اس کی چمکدار رنگت دمک رہی تھی، وہ دروازہ بند کرتی اس کی سمت بڑھ آئی۔

''کیا بات ہے؟ ایسے کیوں بیٹھی ہو؟'' اس نے تشویش سے پوچھا تھا، اس نے اپنی پانیوں سے بھری نگاہیں اٹھا کر ارم کو دیکھا اور ایک جھٹکے سے اٹھ کر اندر کی طرف بڑھ گئی، ارم ہکا بکا سی بیٹھی رہ گئی، پھر بے ساختہ اٹھی اور اس کے پیچھے چل پڑی، وہ بیڈ پہ بیٹھی سسک رہی تھی۔

''حرم! کیا بات ہے؟ کچھ بتاؤ تو ہوا کیا ہے؟'' وہ جھلا سی گئی تھی، حرم نے سختی سے اپنی آنکھیں رگڑ دیں۔

''کچھ نہیں، کھانا لاؤں تمہارے لیے؟''

اس نے اٹھتے ہوئے پوچھا، اسے پتا تھا کہ اب وہ لاکھ پوچھنے پر بھی کچھ نہیں بتائے گی۔

''کیا بنایا ہے؟'' ارم نے چادر اتار کر تہہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''دال چاول۔'' اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔

''ہاں لے آؤ۔'' وہ پلٹ کر الماری میں چادر رکھنے لگی، پھر بیڈ پہ بیٹھ کر جوتے کا اسٹریپ کھولا اور جوتے اتار کر سائیڈ پہ ڈال دیئے، چند منٹ بعد وہ اس کے لیے چاول لے آئی، ارم اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''اماں کہاں ہیں؟'' اس نے بے صبری سے نوالہ بناتے ہوئے پوچھا۔

''ادھر ہی ہیں کچن میں، تم سناؤ سکول میں سب ٹھیک رہا؟'' حرم نے اس کی دھیان کی رو موڑ دی، ارم ایک پرائیویٹ سکول میں ٹیچنگ کر رہی تھی۔

''ہاں بس کیا بتاؤ؟ اینول فنکشن آ رہا ہے اسی سلسلے میں مصروف ہے سارا سٹاف، یہ پرائیویٹ سیکٹر تو خون نچوڑ لیتا ہے سچ میں، اتنا کام کروا رہے ہیں ہم سے اور پے کرتے وقت جان نکلتی ہے۔'' ارم نے اپنی بھڑاس نکالی۔

''اچھا کب ہے فنکشن؟'' حرم نے دلچسپی سے پوچھا۔

''تمہیں کیا؟ کون سا تمہیں ساتھ جانے کی توفیق ہو گی، پچھلی بار کی طرح اس بار بھی ٹرخا دو گی جھوٹے وعدے پہ۔'' ارم نے جتاتے ہوئے پانی کا گلاس اٹھایا حرم آہستگی سے مسکرا دی۔

''ارے نہیں بھئی، اس بار پکا، چلوں گی۔'' اس نے یقین دلایا۔

''پکا وعدہ؟'' ارم نے مشکوک ہو کر اسے دیکھا اور پوچھا۔

''ہاں، پکا وعدہ۔'' اس نے پھر سے مسکرا کر کہا۔

اسی وقت اماں اندر آ گئیں، انہوں نے نماز کے اسٹائل میں دوپٹہ لپیٹا ہوا تھا۔

''آ گئی ارم؟'' انہوں نے پوچھا۔

''جی اماں! اور اب مجھے بتائیں اس کو کیا کہا تھا آپ نے، جب میں آئی تو بیٹھی رو رہی تھی، میرے بار بار پوچھنے پر بھی نہیں بتایا اس نے۔'' ارم نے فوراً حرم کی شکایت کی۔

اماں کے چہرے پر بے چارگی کے ساتھ ساتھ دکھ بھی ابھر آیا تھا۔

''حرم! کیوں میری بے بسی کا مذاق اڑاتی ہے بچی، میرے اختیار میں ہوتا تو کیا میں تجھے گھر بٹھا کر رکھتی؟'' انہوں نے آنسوؤں سے بھری آنکھیں لئے اس سے سوال کیا تو وہ نظر چرا گئی۔

''مجھے شادی کرانے کا کوئی شوق نہیں ہے اماں۔'' اس نے چٹختے ہوئے لہجے میں کہا۔

''آپ میری وجہ سے ارم کے ساتھ کیوں ظلم کر رہی ہیں، اس کا کیا قصور ہے؟ میری قسمت میں جب شادی کا ہونا لکھا ہو گا ہو جائے گی۔'' وہ اس بار نسبتاً دھیمے پن سے بولی تھی، اس کی آواز کی محرومی اس کے اپنے اندرونی احساسات کے بجائے اس معاشرے کی دین تھی، ارم نے لب بھینچ کر اسے دیکھا تھا۔

''اپنی فراغ دلی اپنے پاس رکھو تم۔'' وہ بھڑکی تھی پھر اماں کی طرف رخ پھیر لیا۔

''اماں! اور آپ بتائیں بات کیا ہے؟''

''کچھ نہیں، تیرے سسرال گئی تھی وہ تاریخ مانگ رہے ہیں شادی کی۔'' انہوں نے بتایا۔

''آپ انہیں انتظار کرنے کا کہیں، جب تک حرم کا نہیں رشتہ طے ہو جاتا وہ اس بارے میں بات مت کریں۔'' ارم کا لہجہ دوٹوک تھا، اماں نے سر پیٹ لیا۔

''پاگل ہو چکی ہو تم دونوں، خاموش ہو جاؤ، میرا دماغ خراب کر کے چھوڑو گی۔'' وہ گھٹنوں پہ زور دیتی اٹھ گئیں۔

کمرے کی خاموشی میں وہ دونوں بے بسی سے بیٹھی ایک دوسرے سے نظر چرا رہی تھیں۔

☆☆☆

رستہ تھا کہ ختم ہونے کا نام ہی نہ لے رہا تھا، اس کے مضبوط ہاتھوں کی گرفت میں اسٹیئرنگ کسی کھلونے کی مانند گھوم رہا تھا، بے دردی سے ہونٹ چباتے ہوئے اس کی آنکھیں ونڈ اسکرین پر مرکوز تھیں اور ذہن بالکل بلینک اور اس دہلا دینے والی خاموشی میں اس کے دل و دماغ میں صرف ایک ہی نام تھا۔

''سارا!''

اس نے گاڑی کو ''فیروز پور روڈ'' کی طرف موڑا تو ٹریفک جام تھا، دس منٹ انتظار کے بعد اس کی برداشت ختم ہونے کو تھی اور دماغ کی رگیں جیسے پھٹ جانے کو تھیں، اس نے بیک ویو مرر سے دیکھا تو اس کے پیچھے گاڑیوں کی لمبی قطار تھی، سگنل توڑنا ناممکن ہی تھا ورنہ اس سخت پریشانی کے عالم میں وہ اپنے ''رولز اینڈ ریگولیشنز'' کو بھی توڑنے پر خود کو آمادہ کر چکا تھا، اس نے بے بسی سے گھڑی کی سرکتی سوئیوں کو دیکھا اور زور سے ہاتھ اسٹیئرنگ پہ دے مارا۔

آنکھوں کی سرخی دم بدم بڑھتی جا رہی تھی، رنگ ٹیون کی آواز نے اسے چونکایا، اس نے پاکٹ سے سیل فون نکالا، شزا کی کال آ رہی تھی، اس نے فوراً پک کی۔

''ہاں شزا بولو!'' وہ عجلت بھری بے قراری سے بولا، اسی وقت سگنل کھل گیا، آگے چلتی ٹریفک جوں کی رفتار سے رینگنے لگی۔

''رومان بھائی کہاں ہیں، پلیز فوراً آئیں، سارا کی کنڈیشن بہت سیریس ہے۔'' اس کی پریشانی سے بھری آواز ابھری اور رومان کا دل جیسے ڈوبنے لگا۔

''آئم جسٹ کمنگ شزا۔'' اس نے سیل فون ڈیش بورڈ پر پھینکتے ہوئے گاڑی کی

رفتار خطرناک حد تک بڑھا دی تھی، پندرہ منٹ بعد وہ فیروز پور روڈ پر واقع ''ایک پرائیویٹ ہاسپٹل'' کے سامنے تھا، اس نے تیزی سے گاڑی پارک کی اور گائنی وارڈ کی طرف لپکا تھا۔

ڈیش بورڈ پر پڑا فون ایک بار پھر بج رہا تھا، چمکدار ہندسوں کے ساتھ ''حسان کالنگ'' کے الفاظ جگمگا رہے تھے۔

شزا اسے جلد ہی مل گئی وہ جیسے اڑتا ہوا اس تک پہنچا تھا، وہ بھی اسے دیکھتے ہی اس کی جانب لپکی اور اس سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، رومان کا رنگ لمحوں میں زرد پڑا تھا۔

''شزا! کیا بات ہے؟ سب ٹھیک ہے نا۔'' اس نے وحشت سے اسے جھنجھوڑ ڈالا تھا۔

''سارا ٹھیک نہیں ہے بھائی، وہ ٹھیک نہیں ہے۔'' وہ روتے ہوئے یہی گردان کرتی گئی، رومان نے پیشانی مسلی اور ایک طویل سانس لے کر اسے دیکھا۔

''فہد کہاں ہے؟''

''وہ یہیں تھے کسی ڈاکٹر سے بات کرنے گئے ہیں وہ..... وہ آ گئے۔'' شزا نے بات کرتے کرتے یکدم اس کے پیچھے دیکھ کر کہا۔

رومان پلٹا تو فہد کو اپنے پیچھے پایا، فہد بلال ایک چھبیس ستائیس سالہ جوان سال شخص تھا جس کی روشن پیشانی اور بے حد گھنے بھورے بال اس کی شخصیت کے چارم میں نہایت اہم کردار ادا کر رہے تھے، اس روشن آنکھیں اس پل قدرے بجھی بجھی سی لگ رہی تھیں۔

''بھائی آپ آ گئے۔'' فہد نے بے ساختہ کہا۔

''ڈاکٹرز کیا کہہ رہے ہیں فہد؟'' وہ بے چینی سے پوچھنے لگا، فہد نے بے اختیار نظر چرائی تھی۔

''وہ..... وہ کچھ بھی نہیں، انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' فہد نے امید دلانی چاہی، رومان نے شدت سے اس کی بات قطع کی تھی۔

''مجھے سچ بتاؤ۔''

''انہوں نے کچھ خاص امید نہیں دلائی، کچھ بھی ہو سکتا ہے۔'' فہد نے دھیمے انداز میں کہا تھا۔

رومان نے لب بھینچتے ہوئے خود پر قابو پانے کی کوشش کی تھی، مگر اس کی ٹانگوں نے یکدم اس کا بوجھ سنبھالنے سے انکار کر دیا تھا، وہ بنچ پر گر سا گیا، اس کی آنکھوں کے آگے

اندھیرا چھا رہا تھا۔

☆☆☆

حرم خاموشی سے معمول کے کام نمٹا رہی تھی، چھوٹے سے گھر میں چھائی خاموشی میں آج اس کی کوئی گنگناہٹ نہیں گونجی تھی، صبح ہی تو خالہ جمیلہ آئی تھیں، جلے دل کے پھپھولے پھوڑتی، رشتوں کی کمی کا رونا روتی وہ کس طرح اس کے دل کو کچوکے لگا رہی تھی شاید وہ لاعلم ہی تھیں ورنہ حرم کا ضبط سے پھیکا پڑتا چہرہ اور آنسو ضبط کرنے کی کوشش میں نڈھال پلکیں انہیں شاید خاموش ہونے پہ آمادہ کر ہی دیتیں، پتا نہیں کیا مسئلہ تھا، ہر دوسرے شخص کو جیسے بس اس کی فکر ہو رہی تھی، ایسا نہیں تھا کہ اماں نے کوشش نہیں کی تھی مگر فی زمانہ بڑھتی ہوئی ڈیمانڈز پر شاید وہ پورا نہ اترتی تھی جبھی ہر بار اس کے برداشت آزمائی جاتی۔

تعبیر سے محروم میرے خواب بہت ہیں
چھوٹی سی کہانی ہے مگر باب بہت ہیں
ہر موڑ پہ مل جاتے ہیں ہمدرد ہزاروں
شاید میری بستی میں ادا کار بہت ہیں

دوپہر کے وقت ارم آئی تو خاصی پر جوش تھی، اس کا فنکشن دو دن بعد تھا اور اس نے حرم سے پکا وعدہ لیا ہوا تھا جانے کا، وہ پالک کے پتے چنتی حرم سے ڈھیروں ڈھیر باتیں کیے جا رہی تھی، یہ دھیان دیئے بنا کہ وہ بس ہوں، ہاں میں سر ہلائے جا رہی تھی۔

''مس فرحت ہیں نا، وہی پیاری سی، وہ کہہ رہی تھیں کہ وہ تو ساڑھی باندھ کر آئیں گی، میں نے کہا، ضرور نہیں آپ پہ بہت جچے گی۔'' ارم نے اس کے جھکے سر کو دیکھا تو زور سے اس کا شانہ ہلایا۔

''میں تم سے مخاطب ہوں حرم بی بی!'' وہ جل کے بولی تھی، حرم بے دلی سے مسکرا دی۔

''سن رہی ہوں۔''

''اچھا، کیا کہہ رہی تھی میں؟'' ارم نے اسے فوراً امتحان میں ڈالا۔

''یہی کہ تم ساڑھی باندھو گی۔'' وہ آہستگی سے بولی، ارم نے سر پیٹ لیا۔

''یہ..... یہ میں کہہ رہی تھی؟ یہ بات سن رہی ہو میری؟ مروتم.....'' وہ تن فن کرتی اٹھی

مگر حرم نے فوراً ہاتھ پکڑ کر بٹھا لیا۔

''اچھا چھوڑو، تم ادھر بیٹھو اور مجھے بتاؤ تمہارے سفیر صاحب کا کیا حال ہے؟'' حرم نے اس سے اس کے منگیتر کا پوچھا اور حسب توقع ارم سب کچھ بھول کر دوبارہ بیٹھ گئی، یہ تو ایسا موضوع تھا جس پر وہ بلا تھکان گھنٹہ بھر بول سکتی تھی۔

''ہاں آیا تھا فون اس کا، مرا جا رہا ہے شادی کے لیے، میں نے بھی کہا جب تک میری بہن کی کم از کم کہیں منگنی نہیں ہو جاتی بھول جاؤ شادی کو، چلا ہی تو پڑا آگے سے، کہتا ہے، میں مر جاؤں گا ارم۔'' وہ ہنستے ہوئے بتا رہی تھی، حرم نے بے ساختہ اس کی مسکراہٹ کے دائمی ہونے کی دعا مانگی۔

''میں نے کہا! مجنوں صاحب، آج کل کے فاسٹ دور میں کوئی کسی کے بغیر نہیں مرتا، تم مرنے کی بجائے اچھا سا پرپوزل دیکھو میری بہن کے لیے۔'' ارم نے جوش سے اسے بتایا۔

''ایسے اچھا نہیں لگتا ارم! کیا سوچے گا بھلا وہ؟'' حرم نے قدرے خفگی سے کہا۔

''رہنے دو، کیوں اچھا نہیں لگتا؟ سب کچھ تو جانتے ہیں ہم ایک دوسرے کے گھر کے متعلق۔'' ارم نے جیسے کان سے مکھی اڑائی۔

''اچھا بابا! جیسے تم خوش، آؤ کچن میں چلتے ہیں، چائے کا موڈ ہے؟'' حرم نے سبزی کی ٹوکری اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

''بالکل ہے میری پیاری بہن، چلو۔'' ارم خوشی خوشی اٹھ گئی۔

☆☆☆

بات تھی محبت کی
عمر بھر کی چاہت کی
بھیڑ میں زمانے کی
ساتھ ساتھ چلنا تھا
امتحان بھی آنے تھے
زندگی کے سب ہی پل
ساتھ ہی بتانے تھے
جانے تم نے کیا سوچا؟

بس ایک پل میں ہی
بات ختم کر ڈالی
کون تم کو سمجھائے
محبتوں کے موسم بھی
روز تو نہیں آتے
زندگی میں اپنوں کو
چھوڑ تو نہیں جاتے
تم کو کیا خبر؟
خواب کی حقیقت کی
بات اس محبت کی
بات اس محبت کی

پوری کائنات جیسے سیاہی اوڑھ چکی تھی اور وہ سفید ایمبولینس ایک روشن نقطے کی شکل اختیار کر گئی تھی، نصف رات بیت چکی تھی، لاہور کی سڑکوں کی رونق بتدریج مدھم پڑنے لگی تھی اور اس مدھم سی روشنی میں وہ سفید ایمبولینس تیزی سے سڑکیں روندتی ماڈل ٹاؤن کی طرف اڑی چلی جا رہی تھی۔

ایمبولینس کے تعاقب میں سیاہ سوک بھی اسی رفتار سے بھاگ رہی تھی، ڈرائیونگ سیٹ پر فہد تھا، اس کے ساتھ رومان تھا اور پچھلی سیٹ پر غم سے نڈھال اور نم آنکھیں لیے شزا تھی جس کی گود میں نومولود ننھی سی گلابی گالوں اور بند مٹھیوں والی بچی تھی، شزا نے تھکن سے چور نظریں اٹھا کر بھائی کی شکل دیکھی جو ساری کائنات سے بے خبر ساکت و صامت بیٹھا تھا، نظریں سامنے ونڈ اسکرین پر براجمان تھیں جن کے پار نظر آتی ایمبولینس اس دنیا کی سب سے تلخ سچائی اپنے اندر سمیٹتے ہوئے تھی۔

رومان کو ایمبولینس کا ہوٹر صور اسرافیل سے مشابہہ لگ رہا تھا، اس کی آنکھوں میں جیسے صدیوں کی برف جم گئی تھی گاڑیاں سفید گیٹ کے سامنے رک گئیں، ایمبولینس میں سے سارہ کی میت نکال کر کوٹھی کے بڑے سے لان میں رکھ دی گئی جہاں پہلے سے بہت سے دوست احباب، رشتے دار اور سارہ کے والدین موجود تھے، وہ سب وہاں تھے مگر رومان کو نجانے کیوں

سب بہت اجنبی سے چہرے نظر آ رہے تھے، پتا نہیں کون کون اس سے گلے مل رہا تھا، اسے دلاسے دے رہا تھا، اسے کچھ پتا نہیں چل رہا تھا، اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا، شزا جیسے اس کی حالت پہ ترس کھا کر اسے سب کے بیچ میں سے نکال کر لے گئی تھی، وہ ساکت نظروں سے اس سارے عمل کو دیکھتا رہا تھا، سارا کی میت کو کندھا دیتے وقت اس کے کندے جیسے ٹوٹ رہے تھے، اسے لحد میں اتارتے وقت اس کا ہاتھ سارا کے بے جان ہاتھ سے چھو گیا، اس کے بے جان وجود میں جیسے کرنٹ سا دوڑ گیا تھا، خشک صحرا آنکھیں پل بھر میں لب لبا لب بھر گئیں تھیں، وہ پاگلوں کی طرح بلند آواز میں رونے لگا، فہد کو لگا جیسے کسی نے اس کا کلیجہ نوچ لیا ہو وہ بے ساختہ آگے بڑھا تھا۔

''رومان بھائی! پلیز اپنے آپ کو سنبھالیں، پلیز خدا کے لیے۔'' فہد نے اسے زبردستی کھینچ کھانچ کر پیچھے ہٹایا تھا۔

قبرستان واپسی کے سارے رستے اس کی آنکھوں نے بے آواز آنسو بہائے تھے، گھر آتے ہی وہ کمرے میں بند ہو گیا تھا، شزا نے بھی زور نہیں دیا تھا، وہ اپنے بھائی کو جانتی تھی، وہ اپنے دکھوں کا اشتہار نہیں لگاتا تھا، وہ خاموشی سے ماتم کرتا تھا، وہ اسے اسی لیے کمرے میں جانے سے نہیں روک سکی تھی، وہ ننھی گڑیا کو گود میں لیے بے بسی سے فہد کو دیکھتی رہی، جس نے اسے ہاتھ دبا کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا تھا۔

رومان نے تو اپنی بیٹی کو بھی بس ایک نظر ہی دیکھا تھا، وہ رومان اور سارا کے ملے جلے نقوش لیے ہوئے تھی، رنگت بے حد سفید اور بال سنہرے وہ بالکل فارنر لگتی تھی، شزا نے بے ساختہ جھک کر اسے چوما اور دل سے رب سے بھائی کے لیے صبر کی دعا مانگی تھی۔

رومان اور سارا کی لو میرج تھی، وہ یونیورسٹی میں ملے تھے، اگرچہ تب رومان یونیورسٹی سے فارغ ہو چکا تھا شادی کا فیصلہ دونوں طرف سے مکمل سوچ سمجھ کر اور تحمل سے کیا گیا فیصلہ تھا، دونوں میں بہت اچھی انڈر اسٹینڈنگ تھی، مثالی محبت تھی، پھر نہ جانے کیا ہوا تھا، اس نے جانے کا اذن کیوں مانگ لیا تھا؟

☆☆☆

ارم کے سسرال والوں کو شادی کی تاریخ دے دی گئی تھی، اماں نے چھوٹی موٹی تیاری تو کر رکھی تھی مگر اب تو جیسے وقت کو پر لگ گئے تھے، وہ ارم کے ساتھ اکثر بازار میں پائی جاتیں اور

باقی رہ گئی حرم تو وہ بہت خوش تھی، آخر کار ارم کی شادی اس کی وجہ سے کسی مسئلے کا شکار ہوئے بغیر خوش اسلوبی سے طے پا گئی تھی۔

انہی دنوں بہت عجیب بات ہوئی تھی، اماں اور ارم حسب معمول بازار گئی تھیں، آج اسے اپنا شادی کا جوڑا لینا تھا، حرم کو کسی طرح بھی اس کے جلد لوٹ آنے کی توقع نہ تھی، جبھی وہ تسلی سے گھر کے کام نمٹا کر نہانے گھس گئی، نہا کر آنے کے بعد اس نے بال سلجھائے اور چائے کا کپ تھام کر برآمدے میں رکھی کرسیوں میں سے ایک پہ بیٹھ گئی، چائے پیتے ہوئے اسے ارم کے سکول کا اینول فنکشن یاد آ گیا، حرم بھی اس کے ساتھ گئی تھی، ارم نے زبردستی اسے تیار کیا تھا اور ہلکے پھلکے لانگ شرٹ اور ٹراؤزر میں بال کھولے حرم اپنی فطری سادگی کے باعث بے ساختہ مس فرحت کی نظروں میں آ گئی تھی، باقی کا فنکشن وہ اس کے ساتھ ہی رہی تھیں، ان کا تعلق اچھی خاصی ویل آف فیملی سے تھا وہ شوقیہ جاب کر رہیں تھیں، حرم کافی دیر ان کو سوچتی رہی، وہ نہ صرف مزاج کی بہت اچھی تھیں بلکہ بہت پیاری بھی تھیں۔

وہ چائے پیتے ہوئے بھی ان ہی سوچوں میں گم تھی جب دروازہ بجا، حرم نے کپ ٹیبل پہ رکھا اور حیرانگی سے دروازے کو دیکھتے ہوئے سوچا کہ شاید اماں اور ارم ہوں، مگر وہ اتنی جلدی کیسے آ گئیں، اس وقت اسے پتا نہیں تھا کہ آنے والے مہمان اس کی زندگی میں کیسا انقلاب لے آئیں گے، اس نے دروازہ کھولا تو وہاں کھڑی دو خواتین نے اسے حیران کر دیا، وہی پیاری سی مس فرحت اس کے سامنے تھیں اور ان کے ساتھ ان سے بھی زیادہ پیاری ایک ینگ سی خاتون تھیں، خاتون کہنا تو شاید زیادتی ہی ہو وہ لڑکی ہی لگتی تھیں۔

''آپ؟'' حرم نے حیران سی ہو کر کہا اور دروازے سے ہٹ گئی، دونوں خواتین اندر آ گئیں۔

''کیسی ہو حرم؟'' فرحت نے اس سے گلے ملتے ہوئے گرم جوشی سے پوچھا۔

''میں ٹھیک ہوں، آپ کیسی ہیں؟''

''میں بھی ٹھیک ہوں اور یہ میری دوست شزا ہیں، ارم کہاں ہے؟'' انہوں نے پوچھا۔

''وہ مارکیٹ گئی ہے اماں کے ساتھ، آئیں آپ اندر آئیں۔'' وہ انہیں لیے ہوئے اندر کی طرف بڑھ گئی۔

''آپ بیٹھیں میں کچھ لاتی ہوں۔'' وہ اٹھنے لگی۔

''ارے نہیں تم بیٹھو، یہ بتاؤ ارم کب تک آئے گی؟''

''کچھ کہہ نہیں سکتی، دیر بھی ہو سکتی ہے۔'' اس نے سادگی سے بتایا۔

''اچھا، فون ہے اس کے پاس؟'' انہوں نے پوچھا، حرم نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اچھا، میں اسے کال کر لیتی ہوں۔'' وہ بیگ میں سے سیل فون نکال کر باہر کی طرف بڑھ گئیں۔

''اور کیا کرتی ہو حرم؟'' خوبصورت سی لڑکی جواب تک خاموش تھی پہلی بار بولی، بلاشبہ اس کی آواز بھی بے حد پیاری تھی۔

''کچھ بھی نہیں گھر میں ہوتی ہوں۔'' حرم نے پیشانی پہ آئے بال کان کے پیچھے اڑسے۔

''آپ کیا کرتی ہیں؟ پڑھتی ہیں؟'' اس نے جواباً پوچھا، شزا بے ساختہ کھلکھلا کر ہنسی تھی۔

''ارے نہیں بھئی، میں پڑھ چکی ہوں، میں شادی شدہ ہوں۔'' اس نے بتایا، حرم کی آنکھوں میں حیرانی اتر آئی۔

''لگتا نہیں ہے۔'' اس نے بے ساختہ کہا۔

''چھ ماہ ہی ہوئے ہیں ابھی۔'' شزا نے کہا۔

''اوہ..... تبھی۔'' حرم نے سر ہلایا، اسی وقت فرحت بھی اندر آ گئیں۔

''آ رہی ہے، میں نے کہا جتنی جلدی ہو سکے پہنچو تم۔'' انہوں نے بیٹھتے ہوئے بتایا۔

''اچھی بات ہے آپ پلیز بیٹھیں میں کچھ لاتی ہوں۔'' حرم کہتی ہوئی تیزی سے باہر نکل گئی۔

''کہو شزا؟'' فرحت نے داد لینے والے انداز میں شزا کو دیکھا۔

''لڑکی تو اچھی ہے اور نرم مزاج بھی۔'' شزا نے تعریف کی۔

''بس ٹھیک ہے باقی میں دیکھ لوں گی۔'' فرحت نے حتمی انداز میں کہا۔

شزا نے سر ہلا کے اردگرد کا جائزہ لینا شروع کر دیا، گو کہ سامان زیادہ بیش قیمت نہیں تھا مگر ہر چیز سے سلیقہ ٹپک رہا تھا اور ستھرائی بھی مثالی لگ رہی تھی، تھوڑی دیر بعد حرم چائے لے کر آ گئی۔

''ارے! کیا تم ہمارے ساتھ نہیں پیو گی؟'' فرحت نے پوچھا۔

''نہیں میں نے ابھی پی ہے۔'' اس نے مسکرا کر بتایا۔

کچھ دیر بعد وہ چائے پی کر فارغ ہی ہوئیں تھی کہ ارم اور اماں آ گئیں، ملنے ملانے کے بعد ارم تو وہیں جم گئی، اماں دوپہر کے کھانے کے لیے سبزی لینے چل دیں تو حرم سب شاپنگ بیگ اٹھا کر دوسرے کمرے میں آ گئی، اماں واپس لوٹیں حرم سب چیزیں اٹھا کر کچن میں آ گئی، ان کے جانے کے بعد حرم کھانا بنا کر واپس لوٹی تو ارم اور اماں کو پریشان اور شش و پنج میں مبتلا دیکھ کر چونک گئی۔

''کیا بات ہے ارم؟'' اس نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''کچھ نہیں، کوئی بات نہیں ہے۔'' اس نے سر جھٹک کر چہرے کے تاثرات بدلے۔

''نہیں کوئی بات تو ہے، اماں آپ بتائیں؟''

''میں نے کہا نا کچھ نہیں، اماں پلیز اسے بتائیں کہ کوئی بات نہیں ہے۔'' ارم نے اس بار قدرے غصے سے کہا، حرم نے اسے گھورا۔

''یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے؟'' اس کا انداز طنزیہ ہوا تھا، ارم نے لب بھینچ کر اسے دیکھا۔

''کہاناں! کچھ نہیں ہے۔'' وہ پیر پٹخ کر باہر کی سمت نکل گئی، اماں نے بھی خاموشی اوڑھ رکھی تھی، حرم نے بھی دوبارہ نہیں پوچھا، مگر رات کو جب سفیر کا فون آیا اور ارم مسکراتے چہرے کے ساتھ سیڑھیاں چڑھ تھی اوپر چلی گئی تو وہ اماں کے پاس آ بیٹھی۔

''بات ہی ایسی ہے میری بچی۔'' انہوں نے تسبیح کے دانے گراتے ہوئے مدھم سی آواز میں کہا۔

''سب ٹھیک تو ہے ناں؟'' اس نے پریشانی سے پوچھا۔

''ہاں سب خیر ہے، وہ جو آج بچی آئی تھی! فرحت کے ساتھ۔''

''جی!'' اس نے سر ہلایا۔

''وہ اپنے بھائی کا رشتہ لائی تھی تمہارے لیے۔'' انہوں نے بڑے سکون سے اس کے سر پر بم پھوڑا تھا، حرم کی آنکھیں پھیل گئیں۔

''کیا؟''

''لڑکا کلوتا ہے، پڑھا لکھا ہے اور خاندان بھی اچھا خاصا امیر ہے۔'' انہوں نے بتایا۔

''تو کچھ یہاں کیا لینے آئیں تھیں، اپنے جیسے امیروں میں ہی کر لیتے۔'' حرم نے تلخی

سے کہا۔

''ہاں تو کر لیں، مگر ایک خرابی ہے، بلکہ خرابی کیا میں تو اسے قسمت کا کھیل ہی کہوں گی۔'' وہ افسردہ سی سانس بھر کے بولیں۔

''کیا خرابی ہے؟'' اس نے قدرے بے تابی سے پوچھا۔

''لڑکا پہلے سے شادی شدہ ہے۔'' اس نے نظریں چراتے ہوئے کہا، حرم کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی تھی۔

''تو دوسری شادی کیوں کر رہا ہوں۔'' وہ حیران تھی۔

''پہلی بیوی کی وفات ہو گئی ہے، بچی ہے چھوٹی سی، بلکہ صرف چند دنوں کی۔''

''اوہ! تو بیٹی کے لیے کر رہا ہے شادی؟'' وہ طنزیہ مسکرائی۔

''نہیں حرم! مجھے شزا نے خود بتایا تھا کہ اس کا بھائی شادی کے لیے نہیں مانتا، بچی کا کیا ہے پل ہی جائے گی گورنس کے ہاتھوں، مگر شزا چاہتی ہے کہ کوئی ایسی ہو جو بچی کو اپنی بیٹی سمجھ کر پالے، وہ اسے آیا کہ حوالے نہیں کرنا چاہتی، جہاں تک اپنی کلاس، اپنے طبقے میں شادی کی بات ہے تو تمہیں بھی پتا ہی ہوگا وہ لڑکیاں ان جھنجھٹوں میں پڑنا پسند نہیں کرتیں۔'' انہوں نے آہستہ آہستہ بات مکمل کی۔

''اور یہ خدانخواستہ کوئی عیب نہیں ہے۔'' انہوں نے دھیمے سے کہا۔

''تو آپ کیا چاہتی ہے؟'' حرم نے بڑے حوصلے سے کہا۔

''شزا تو کہہ رہی تھی اگر آپ راضی ہیں تو ارم کے ساتھ ہی سادگی سے نکاح کر لیں گے، انہیں کچھ نہیں چاہیے، فرحت بھی بڑی وکالت کر رہی تھی کہ آنٹی! اس میں کوئی عیب نہیں ہے، ماشاءاللہ پورے ہاتھ پیر کا جوان جہان مرد ہے، مجھ سے ارم نے کہا تھا کہ حرم کے لیے اگر کوئی رشتہ ہو تو ضرور بتاؤں، مجھے حرم بالکل بہنوں کی طرح عزیز ہے، مجھے لگا کہ یہ اس کی خوش قسمتی ہوگی اگر وہ شزا کی بھابھی بن جائے، وہ تو گارنٹی بھی دے رہی تھی کہ سب کچھ ہماری مرضی کا ہوگا، ان کی کوئی ڈیمانڈز نہیں ہوں گی۔'' وہ کہہ رہی تھی اور حرم کے ذہن میں صرف دو لفظ ہی گونج رہے تھے۔

سادگی سے نکاح، اور.....؟ نو ڈیمانڈز۔

''آپ جو چاہتی ہیں وہ ہی ہوگا اماں! میں آپ کی رضا میں راضی ہوں۔'' حرم نے

ان کی گود میں چہرہ چھپالیا۔

انہوں نے بے ساختہ اس کے سر پر بوسا دیا تھا، ان کی صابر بیٹی کی آزمائش ختم ہونے کو تھی، مگر.....! کون جانتا ہے آزمائش ختم ہونے کو تھی یا شروع؟ رب کے راز اس کی رضا کے بغیر کون جان سکتا ہے؟۔

(آپ کو لگتا ہے کہانی بڑی ٹیپکل سی ہے، مجھے بھی یہی لگا تھا، مگر ہمیشہ ویسا نہیں ہوتا جیسے ہمارے اندازے ہوتے ہیں، میری طرف آپ کو بھی لگا ہوگا کہ اب دونوں کی شادی ہو جائے گی، ہیرو صاحب تھوڑے سے اکڑو ہوں گے مگر جب وہ ہیروئن صاحبہ کی بے لوث خدمت اور صبر دیکھیں گے تو دل نرم پڑ جائے گا اور یوں قارئین ایک اور ہیپی اینڈنگ سے محظوظ ہوں گے۔

''یہ سب ہمارے اندازے ہیں۔'' اور میں نے کہا نا کہ اندازہ ہر بار اچھا رزلٹ دے ضروری نہیں۔

یہ کہانی کس طرح مختلف ثابت ہوئی میرے لیے اور آپ کے لیے، آیئے دیکھتے ہیں، چلتے ہیں رومان اور حرم کے پاس۔)

☆☆☆

''تمہارا دماغ خراب ہو چکا ہے شزا! مجھے تمہاری کوئی فضول بات نہیں سننی۔'' وہ تو شادی کا موضوع سنتے ہی ہتھے سے اکھڑ گیا تھا۔

''اوہ..... بھائی! آپ پہلے میری پوری بات تو سن لیں۔'' وہ جھلا کر الٹ پڑی تھی۔

''مجھے تمہاری بے وقوفانہ باتوں میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔'' وہ مزید خفا ہوا تھا۔

شزا نے بے بسی سے فہد کو دیکھا اور اس کے پہلو سے اٹھ کر رومان کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔

''شادی تو آپ کو کرنی ہی ہے ناں، آج نہیں تو کل۔''

''تم سے کس نے کہا کہ مجھے شادی کرنی ہے؟'' وہ الٹا پڑ گیا، اب کی بار فہد بیچ میں کود پڑا تھا۔

''بھائی جان! پلیز..... کیا آپ کو ویران زندگی گزارنی ہے، نہیں نا، تو پھر کیا حرج ہے شزا کی بات ماننے میں؟'' اس نے تحمل سے کہا۔ ''نہیں فہد پلیز! میں ابھی ذہنی طور پر بالکل تیار

نہیں کسی نئے رشتے کو بنانے کے لیے۔'' وہ سخت اپ سیٹ نظر آ رہا تھا۔

''مجھے پتا ہے آپ تیار نہیں ہیں مگر یہی وقت صحیح فیصلہ لینے کا ہے، اگر آپ اسی ٹینشن میں رہیں گے تو آپ تو پاگل ہو جائیں گے اور لائبہ کا کچھ سوچا ہے آپ نے؟'' فہد نے سنجیدگی سے کہا، رومان نے سختی سے لب بھینچ لیے تھے۔

''ابھی سارا کو گئے دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔'' وہ اذیت سے بولا تھا۔

''تو آپ کوئی خدانخواستہ بیوہ تو نہیں ہیں جس کے لیے عدت پوری کرنا لازم ہو۔'' شزا حسب عادت بنا سوچے سمجھے جھٹ سے بولی، اتنی Critical سچویشن میں بھی فہد کو ہنسی آ گئی۔

''رومان بھائی! آپ مجھے صرف ایک بات کا جواب دیں، کیا آپ لائبہ کو بھی اپنے جیسی زندگی دینا چاہتے ہیں؟'' فہد کے سوال نے رومان کو سوچوں اور یادوں کی وادی میں دھکیل دیا تھا۔

''لیکن اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ وہ آنے والی لڑکی اسے ماں بن کے پالے گی؟'' اس نے جرح کی۔

''اچھا سوال ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ بچوں کے جھنجھٹ میں نہ پڑنے کے چونچلے اپر کلاس کی لڑکیوں کے ہوتے ہیں، مڈل کلاس کی لڑکیاں عمومی طور پر سمجھوتا کرنا جانتی ہیں۔''

''یہ کوئی کرائے ٹیریا نہیں۔'' اس نے رد کیا۔

''بالکل ٹھیک کہا ہے آپ نے، یہ کوئی کرائے ٹیریا واقعی نہیں ہے، لیکن بہر حال ہوتا ایسا ہے۔''

''تو پھر تم دونوں کیا چاہتے ہو؟'' وہ جیسے عاجز آ گیا تھا۔

''آپ ہاں کر دیں۔'' شزا کا لہجہ حتمی تھا، وہ بے بس سا ہاں میں سر ہلا گیا تھا۔

مگر وہ اندرونی طور پر اس قدر ڈسٹرب تھا کہ حسان کو بتائے بغیر رہ نہ سکا تھا، حسان اس کا بہترین دوست تھا اور اس سے کبھی اس نے کچھ نہ چھپایا تھا۔

''دیکھ رومان! پریشان ہونے سے مسائل حل نہیں ہوتے، مجھے یہ بتاؤ اس لڑکی کا حدود اربعہ کیا ہے؟''

''شزا بتا رہی تھی کہ گریجویٹ ہے اور بہت نرم مزاج کی سلجھی ہوئی لڑکی ہے۔''

''یہ تو ٹھیک علامات ہیں، مگر تم آخر کس قسم کے تحفظات کا شکار ہو؟'' وہ الجھ گیا تھا۔

''بس یہی سوچ رہا ہوں کہ اگر وہ ایسی ثابت نہ ہوئی تو؟''

''تو اس میں سوچنے کی کیا بات ہے؟ تجھے ایک بہت عام سی حقیقت بتاؤں بلکہ تو اسے کامن سینس ہی سمجھ، یہ جو مڈل کلاس لڑکیاں ہوتی ہیں نا مرتی ہیں دولت کے پیچھے، امیروں پہ ان کی رال بڑی جلدی ٹپک پڑتی ہے اور تو، تو خیر سے ہینڈسم پلس امیر ہے تو تجھے دیکھ کر تو اس کے حواس ہی جواب دے جائیں گے، مگر آج تجھے ایک پتے کی بات بتاؤں، تو اسے اس کی ''اوقات'' میں رکھنا۔''

''کیا مطلب؟'' رومان کی پیشانی پہ شکن آ گئی۔

''مطلب دیکھنا وہ چاہے گی تو اس پر بے تحاشہ پیسہ لٹائے آفٹر آل وہ تیری نئی نویلی بیوی ہوگی اور یہ بھی یاد رکھا کہ یہ اس کی پہلی شادی ہی ہے، دوسری تو تیری ہوگی نا۔''

''مجھے تمہاری فلاسفی بڑی عجیب لگ رہی ہے حسان! اور سوری ٹو سے..... مگر اس وقت تم بڑے Mean لگ رہے ہو۔'' وہ صاف گوئی سے بولا، حسان برا ماننے کی بجائے ہنس دیا۔

''تیرے بھلے کو کہہ رہا ہوں یار! یہ لڑکیاں بڑی عجیب ہوتی ہیں، کوئی تو وجہ ہے جو وہ تجھ سے شادی پہ تیار ہے، دیکھ تیری دوسری شادی ہے اور تو ایک بچی کا باپ بھی ہے۔''

''تجھے کیا لگتا ہے؟ کیا ریزن ہے؟''

''آف کورس پیسہ میری جان پیسہ۔'' حسان طنزیہ مسکرایا، رومان نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔

''کیا پیسہ اتنا میٹر کرتا ہے؟''

''آف کورس کرتا ہے، خاص طور پر ان Lower edges کے لیے۔'' حسان نے لاپرواہی سے شانے جھٹکے، رومان نے سمجھنے والے انداز میں سر ہلا دیا تھا۔

☆☆☆

ارم نے جب سے حرم کی ہاں کے بارے میں سنا تھا وہ اس سے سخت خفا تھی اور صبح سے تو اس کی بات کا جواب بھی نہیں دے رہی تھی، حرم نے بھی اسے چھیڑنا مناسب نہ سمجھا تھا، اماں نے کل باقاعدہ طور پر رومان کو ہاں کر دی تھی، شاید اسی لیے ارم اتنی سختی سے ناراض نظر آتی تھی، سارا دن اس کی خاموشی جھیلنے کے بعد وہ رات میں جب سونے کے لیے لیٹیں تو حرم سے

رہا نہیں گیا۔

''تم مجھ سے خفا ہو؟''

''نہیں، مجھے کیا ضرورت ہے؟'' ارم کا لہجہ اکھڑا ہوا تھا۔

''مجھے سمجھ آ رہی ہے ارم کہ تم کس بات کو لے کر اس طرح کا رویہ اپنائے ہوئے ہو؟''

''نہیں، تمہیں سمجھ ہی تو نہیں آ رہی؟ کیوں کی تم نے ہاں؟ آخر کمی کیا ہے تم میں؟ تم اس شخص کی دوسری بیوی بننے پر تیار ہو؟'' ارم پھٹ پڑی تھی، حرم نے بڑے سکون سے اس کی بات سنی تھی، وہ پہلے ہی ذہنی طور پر تیار تھی ارم کے اس قسم کے سوالوں کے لیے۔

''پہلی بیوی بنانے پہ کوئی تیار نہیں، میں نے سوچا دوسری ہی بن جاؤ۔'' حرم نے سفاکی سے جیسے اپنے ہی بخیے ادھیڑ ڈالے تھے۔

''تم..... یہ تم کہہ رہی ہو؟'' ارم کی آنکھیں پھیل گئیں۔

''تو اور کیا کہو؟ اماں بتا رہی تھیں لڑکا اچھا خاصا خوبصورت ہے، امیر تو وہ ہیں ہی، تو مجھے اور کیا چاہیے؟'' وہ لاپرواہی سے کندھے جھٹک کر بولی۔

''تم اتنی مادیت پرست کب سے ہوگئی ہو؟'' ارم کو بے حد صدمہ ہوا تھا۔

''اوہ ہو..... ارم! اس میں مادیت پرستی کہاں سے آ گئی ایک لڑکی کو اور کیا چاہیے؟'' اس نے سر جھٹکا اور رخ پھیر کر لیٹ گئی۔

''وہ ایک بچی کا باپ ہے؟'' ارم نے قدرے بلند آواز میں اسے یاد دلایا۔

''پتا ہے مجھے۔'' اس کا اطمینان برقرار تھا۔

''آخر تمہیں شادی کروانے کا اچانک سے اتنا شوق کیوں اٹھ رہا ہے؟'' وہ جھلا گئی تھی۔

''تمہاری شادی دیکھ کر۔'' اس نے سکون سے کہا۔

''اوہ تو یہ بات ہے، تم فرار چاہ رہی ہو یہاں سے؟'' ارم کا لہجہ اس بار کھوج لگاتا ہوا تھا۔

''ہاں میں یہاں سے فرار چاہتی ہوں، میں تھک چکی ہو ریجیکٹ ہو ہو کر، میں اکتا گئی ہوں لوگوں کے سوالات سے اور..... اور مجھے اپنی ماں کی بے بسی سے ڈر لگتا ہے۔'' حرم کا لہجہ اور آواز بھیگ گئی تھی، ارم بے ساختہ اس سے لپٹ گئی، دونوں کی مدھم سسکیاں کمرے میں گونج رہی تھی۔

آؤ جانچ لیتے ہیں
درد کے ترازو پر

کس کا غم کہاں تک ہے
شدتیں کہاں تک ہیں
کچھ عزیز لوگوں سے
پوچھنا تو پڑتا ہے
آج کل محبت کی قیمتیں
کہاں تک ہیں
اک شام آجاؤ
کھل کے حال دل کہہ لیں
کون جانے.....؟
سانسوں کی مہلتیں کہاں تک ہیں

☆☆☆

دونوں کی شادیاں بہت خیر اسلوبی سے ہوگئیں، اماں بے حد خوش تھیں، ارم سفیر کے سنگ رخصت ہوئی اور حرم رومان کے ساتھ اس کے بڑے سے محل جیسے گھر میں آگئی، شزا اسے بہت خوبصورتی سے سجے بیڈروم میں چھوڑ گئی تھی، وہ تھکی ہوئی تو تھی مگر اس وقت بہت اشتیاق سے کمرے کا جائزہ لینے میں مگن تھی جب آہستگی سے دروازہ کھولا گیا، حرم کی نگاہ بے ساختہ دیوار سے ہوتی ہوئی کھلنے والے دروازے پر مرکوز ہوگئی، ایک دراز قامت شخص دروازے سے اندر داخل ہو رہا تھا، وہ دروازہ بند کر کے پلٹا تو بھی حرم کی نگاہ اس پہ جمی ہوئی تھی، وہ ایک مجسمے کی طرح یک ٹک اسے دیکھ رہی تھی، اس کا قد لمبا تھا اور رنگت سرخ وسفید چمکدار بھوری آنکھیں اور سیدھے بھورے بال جن میں ہیں کہیں سنہرا پن جھلکتا تھا، اسے دیکھ کر حرم کے ذہن میں بس ایک ہی لفظ آیا تھا۔

''وجیہہ وشکیل۔''

وہ اتنا خوبصورت تھا کہ حرم کو اپنی خوش قسمتی پہ یقین آنے لگا تھا، بلکہ شاید اپنی Limited life میں رہتے ہوئے بھی اسے اعتراف تھا کہ اس نے شاید ہی کبھی اتنا ہینڈسم مرد دیکھا ہو، وہ آہستگی سے چلتا ہوا اس کے نزدیک آیا اور کراؤن سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہوگیا۔

''حرم!'' اس کی بھاری اور گھمبیر آواز ابھری تھی، حرم کی دھڑکن بڑھ گئی تھی۔

''آپ چینج کر کے ایزی ہو جائیں پھر بات کرتے ہیں۔'' اس کا لہجہ دھیما مگر تحکمانہ تھا۔

حرم کو چند سیکنڈ لگے اس کی بات سمجھنے میں پھر وہ خود کو سنبھال کر اٹھی اور آہستگی سے چلتی ڈریسنگ ٹیبل کے آگے بڑھ گئی، اس نے ہاتھوں میں پہنی چوڑیاں اتارنا شروع کر دیں، آہستہ آہستہ احتیاط سے چوڑیاں اتارنے کے بعد اس نے ہاتھوں میں پہنی انگوٹھیاں اتارنا شروع کر دیں تھیں، مہندی سے بھرے ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے اسے ارم کی کتنی ہی بے ساختہ شوخیاں اور معنی خیز شرارتیں یاد آنے لگیں تھیں، اس نے زور سے آنکھیں میچتے ہوئے اندر اٹھتے شور کو دبایا اور دوپٹے پر لگی پنیں اتاریں، اب وہ دوپٹہ اتار کر سینے پہ پھیلا چکی تھی، کانوں اور گردن میں پہنے جانے والے زیورات اتار کر دراز میں رکھے اور باتھ روم کی سمت بڑھ گئی، بیس منٹ بعد جب وہ واپس آئی تو شاور لے چکی تھی، بالوں کو تولیے میں سمیٹے لائٹ پنک کلر کے شلوار سوٹ میں وہ دھلے دھلائے چہرے کے ساتھ اس کے سامنے تھی، سپاٹ چہرے کے ساتھ ڈریسنگ ٹیبل کے آگے بیٹھ کر اس نے بال سلجھائے۔

وہ خود پر رومان کی جمی نگاہ محسوس کر سکتی تھی اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ ان نگاہوں میں اس کے لیے کوئی جذبہ نہ تھا، بالکل نارمل سا انداز جیسے ہم کسی معمول کے منظر پر نگاہ دوڑائیں اور اس میں کچھ نیا نہ پا کر نگاہ ہٹا لی جائے۔

اب وہ شاید اس سے کچھ کہہ رہا تھا، حرم اس کے الفاظ کو سمجھنا چاہ رہی تھی مگر اسے بس رومان کے ہلتے لب دکھائی دے رہے تھے، وہ پتا نہیں کیا کہہ رہا تھا، حرم کو یکلخت اپنا سانس بند ہوتا محسوس ہونے لگا تھا، اس کا احساس کمتری پوری طرح اسے اپنے گھیرے میں لے چکا تھا، وہ بہت خوبصورت تو نہیں تھی مگر قبول صورت ضرور تھی، مگر اس پل اسے لگ رہا تھا وہ رومان لاشاری کے سامنے کچھ بھی نہیں تھی، بلکہ ناقابل قبول تھی، اس کا دل چاہ رہا تھا کاش وہ وہاں سے بھاگ سکتی؟

یکدم بڑی سی سلائیڈنگ ونڈو پر ٹپ ٹپ بوندیں برسی تھیں اور پھر تیز بارش شروع ہو گئی، بارش بھی کیا نعمت ہے رب کی، بارش کوئی سے بھی ہو ہمیشہ دھرتی کی ضرورت ہی ہوتی ہے، مگر کتنا فرق ہوتا ہے بارش میں بھی۔

باہر برسنے والی بارش بہت پرجوش تھی، تیز اور ٹھنڈی اور اندر برسنے والی بارش بہت مدھم تھی، آہستہ اور دہکی ہوئی آگ کی مانند.....جس میں اس کا سارا وجود جل جانے کو تھا، بارش تھم

گئی، رات بیت گئی اور دن نکل آیا، چمکدار اور سنہری دن جس نے رات کی تاریکی کو نگل لیا تھا اور اس سنہری دن میں چمکتے ہوئے درختوں کو یک ٹک دیکھتے ہوئے حرم نے بیڈ پر دراز اس مرد کو دیکھا جسے دیکھ کر اسے صرف ایک ہی لفظ یاد آیا تھا۔

''برتا ہوا مرد۔''

ایسا مرد جو ہر لحاظ سے برتا جا چکا تھا، برتے ہوئے جذبات برتے ہوئے احساسات، معمول کا انداز، سرد مہری کی انتہا تھی یا اپنے صرف ضرورت ہونے کا احساس، وہ نہیں جانتی تھی مگر ان سب پر حاوی صرف ایک ہی جذبہ تھا ''احساس کمتری'' اور اس احساس نے جیسے اسے اندر تک تھکا ڈالا تھا، ابھی تو سفر کا آغاز تھا مگر وہ ابھی سے ہی نڈھال ہو کر گر پڑی تھی۔

کہا جاتا ہے ''مرد ہر نئی عورت کے پہلو میں بیٹھ کر نیا ہو جاتا ہے۔'' اگر یہ کہاوت صحیح بھی تھی تو کم از کم ''رومان لاشاری'' کے لیے نہیں ناشتے کی میز پر شزا اور فہد بھی موجود تھے، سارا کی وفات کے بعد سے شزا یہیں تھی اور وہ ہی ننھی لائبہ کو سنبھال رہی تھی۔

''گڈ مارننگ حرم!'' شزا نے مسکراتے ہوئے اسے وش کیا۔

''صبح بخیر۔'' وہ ہلکے سے مسکرائی اور رومان کو فہد کے ساتھ آتا دیکھ کر ان دو بھوری آنکھوں میں کیسی حیرت اتر آئی تھی۔

''تمہیں میرے بھائی کیسے لگے حرم؟'' شزا شرارت سے مسکرائی تھی۔

جواباً وہ آہستہ سے سر جھکا گئی تھی، اس کی اس شرمیلی ادا پہ سب حیرت زدہ رہ گئے تھے، شزا بے ساختہ کھلکھلائی تھی۔

''رومان بھائی! آپ کو حرم کیسی لگی؟ اس کا جواب تو مجھے مل گیا۔'' اب کہ وہ رومان کے سر ہوئی تھی۔

رومان نے ایک سپاٹ نظر اپنے پہلو میں بیٹھی حرم پہ نگاہ دوڑائی جو طاؤس شلوار کرتا میں اس کے مقابل اور بھی عام لگ رہی تھی۔

''فضول باتیں مت کرو شزا! ناشتہ شروع کرو۔'' اس کا لہجہ سرد تھا حرم کے اندر تک اس کی سرد مہری اتر گئی تھی، ایک زہریلی سوئی ٹھک سے اس کے دل میں پیوست ہو گئی اور اس نے صبر اور برداشت کا پہلا سبق پڑھ لیا تھا۔

☆☆☆

ہم دشت کے باسی ہیں اے شہر کے لوگو!
یہ روح پیاسی ہیں ورثے میں ملی ہے
دکھ درد سے صدیوں کا تعلق ہے ہمارا!
آنکھوں کی اداسی ہمیں ورثے میں ملی ہے

''لائبہ!'' سے اسی شام اس کی پہلی ملاقات ہوئی تھی، شزا بہت مان اور پیار سے سارا گھر اور ''لائبہ'' اس کے سپرد کر کے اپنے گھر سدھاری تھی اور حرم تو لائبہ کو دیکھ کر دنگ رہ گئی، وہ تو اپنے باپ سے بھی بڑھ کر خوبصورت تھی اور حرم نے کسی کا بھی خیال کیے بغیر اسے بے ساختہ اور بے اختیار اتنا چوما کہ وہ کسمسانے لگی، جوش و خوشی کے ملے جلے احساس سے اس کا رنگ سرخ پڑا ہوا تھا۔

''یہ کتنی پیاری ہے شزا آپی!'' وہ مسکرائی تھی، شزا جو اس کے اتنے بے ساختہ رویے پر حیران سی تھی، بے ساختہ سکون محسوس کر کے مسکرائی تھی۔

''بہر حال تمہاری ہی بیٹی ہے حرم۔'' اس نے حرم کو کتنا مان دیا تھا۔

''جی میری بیٹی۔'' حرم نے لائبہ کو سینے سے بھینچ لیا، شزا نے داد لینے والے انداز میں رومان کو دیکھا تو جو خود بھی حیرت کی زد میں تھا۔

''او کے جانی میں چلوں۔'' شزا اس سے الوداعی ملاقات کے بعد رخصت ہو گئی تھی۔

کچھ دیر بعد رومان بھی سجا سجایا گاڑی لے کر نکل گیا، وہ بوکھلائی سی پھرنے لگی، اس نے سارا گھر دیکھ ڈالا، اتنا بڑا اور اتنا خوبصورت گھر کہ وہ دنگ سی رہ گئی تھی، حیرت اسے اس بات کی تھی کہ کیا اتنے بڑے گھر میں وہ تنہا رہے گی، وہ لائبہ کو لے کر بیٹھی تھی جب زینت اس کے پاس آ گئی، زینت اس گھر کی واحد ملازمہ تھی جس کے ذمہ تقریباً سبھی کام تھے، وہ ادھیڑ عمر خاتون تھیں۔

''بی بی! کھانا تیار ہے لگاؤں؟''

''نہیں آپ جائیں لائبہ کے پاپا آئیں گے تو ہی لگایئے گا۔''

''ان کا آنے جانے کا کوئی وقت نہیں ہے'' اس کا لہجہ سپاٹ تھا، حرم نے کسی قدر چونک کر اسے دیکھا۔

''جیسا میں نے کہا ہے، ویسا ہی کیجیے۔''

''جی!'' وہ کچھ بھی اور کہے بغیر اٹھ گئی۔

☆☆☆

''محرومیاں'' ہر انسان کی زندگی میں ہوتی ہیں، بعض انسان ان سے سمجھوتہ کر لیتے ہیں، انہیں اپنا نصیب سمجھ کر صبر کر لیتے ہیں اور بعض انہیں برداشت ہی نہیں کر پاتے، ساری زندگی کا روگ بنا لیتے ہیں۔

ایسی ہی کچھ محرومیاں ''حرم'' اور ''رومان'' کی زندگی میں بھی تھیں۔

''حرم!''

کتنی بہت ساری محرومیاں تھیں اس معصوم لڑکی کی زندگی میں، سب سے پہلے باپ کی محرومی، محض سترہ سال کی عمر میں یتیم ہونا، کیا اس سے بڑی محرومی ہے؟

ذرا ہوش سنبھلا تو اردگرد موجود نظروں نے احساس دلانا شروع کر دیا کہ وہ خوبصورتی سے محروم تھی۔

''وہ خوبصورتی جو کسی بھی لڑکی کا سب سے ضروری جز سمجھا جاتا ہے، شاید سمجھا نہیں جاتا بلکہ یہ تو معاشرے کا بنایا ہوا کرائے ٹیریا ہے، سونے پہ سہاگہ اس کے متضاد ارم بہت خوبصورت تھی، سرخ و سفید رنگت اور خوب چمکدار آنکھیں لیے وہ ہر کسی کی توجہ کا مرکز بننے کی صلاحیت رکھتی تھی، حرم کے لیے آنے والا ہر پرپوزل خود بخود ارم کی طرف منتقل ہو جاتا۔

اس ''کمی'' نے اس کے اندر ''احساس کمتری'' بیدار کرنے میں پورا کردار ادا کیا تھا، ایسا نہیں تھا کہ وہ ارم سے جیلیس تھی مگر اردگرد احساس دلانے والے اتنے تھے کہ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی سوچنے پر مجبور ہو جاتی، گندمی رنگت، عام سی کالی آنکھیں، چھوٹا سا ناک اور قدرے ابھرے ہوئے عنابی ہونٹ وہ بہت خوبصورت تو نہیں مگر پرکشش ضرور تھی اور اس کشش میں کسی حد تک ہاتھ اس کے سیاہ اور براؤن امتزاج کے کرلی بالوں کا بھی تھا، جو سر سے بالکل سیدھے تھے مگر کندھوں تک جاتے جاتے گھنگھریالے ہو جاتے تھے، کبھی وہ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر سوچتی کہ اس کے چہرے پر ایسا کچھ نہیں تھا جو کسی کو متوجہ کرنے کا باعث بنتا، وہ لاشعوری طور پر ہر کسی سے کٹنے لگی۔

پتا نہیں کیسی زندگی تھی، بے رنگ، بے مقصد، یا شاید اسے لگتا کبھی کبھی تو اسے لگتا وہ زندگی میں شاید اسی انتظار میں مر جائے گی کہ عام نارمل لڑکیوں کی طرح وہ بھی زندگی گزار سکے،

عام نارمل لڑکی جس کی زندگی شادی سے شروع ہو کر اپنے گھر تک ختم ہو جاتی ہے، شاید وہ عام لڑکی نہیں تھی۔

''رومان لاشاری'' سے شادی سراسر ایک فرار تھا، گھٹے ہوئے تنگ نظر معاشرے سے ایک فرار، جہاں ہر دوسرے شخص کو یہ ٹینشن تھی کہ اس کی شادی کیوں نہیں ہو رہی، جب اماں نے اس سے رومان کی بابت دریافت کیا تب اس کے دماغ میں قطعی طور پر وہ کچھ نہیں تھا جو اس نے ارم سے کہہ ڈالا تھا، وہ صرف ارم کو ٹالنے کے لیے ایک جواز تھا۔

مگر رومان لاشاری سے شادی اس کی زندگی کا سب سے عجیب واقعہ بلکہ حادثہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا ثابت ہوئی تھی، یہ سب اتنا حیرت انگیز تھا کہ وہ بہت دن تو سمجھ ہی نہ پائی کہ اس کے ساتھ یہ ہوا کیا تھا۔

عجیب تھا وہ شخص، اپنی ذات میں مگن اسے بڑی شدت سے اپنی جانب کھینچنے والا یہ انسان ہر لحاظ سے عجیب تھا، حرم کو وہ خود سے اتنے فاصلے پر لگتا کہ اسے لگتا وہ صدیوں بعد بھی اس تک نہ پہنچ پائے گی، اتنا ہی دور تھا وہ وہ مشرق تھی تو رومان مغرب۔

وہ Eliteclass کا بڑا Well organized بندہ تھا جس کے افعال و اعمال بڑے Well Planned اور Measured تھے، وہ جتنا خوبصورت تھا اتنا ہی سرد مزاج تھا اور جتنا سرد مزاج تھا اتنا ہی بے نیاز، وہ بولتا نہیں تھا بلکہ حکم دیتا تھا، ہوتے ہیں بعض لوگ جنہیں خدا بڑی محبت سے بناتا ہے اور جن کی قسمت بڑی Rich ہوتی ہے وہ ہر لحاظ سے مالا مال ہوتے ہیں۔

''رومان لاشاری'' بھی دنیاوی نعمتوں سے مالا مال ایسا ہی ''ایک انسان'' تھا، حرم کو حیرت ہوتی وہ کیوں آ گئی تھی اس کی زندگی میں؟ اس محل میں اس کی جگہ کہاں تھی؟

''رومان لاشاری تو شہزادہ تھا اور اس شہزادے کے لیے تو کوئی ملکہ ہی ہونے چاہئے تھی وہ کہاں سے آ گئی؟''

''حرم، وہ تو اس کی کنیز بننے کے قابل تھی۔'' حرم اسے بڑی حسرت سے دیکھتے ہوئے سوچتی تھی۔

ناآسودگیوں کا ایک طویل سلسلہ تھا جو اس کی زندگی میں زہر گھولتا رہا تھا اور اب بھی گھول رہا تھا، رومان لشاری کے سامنے اس کا احساس کمتری اور بھی بڑی طرح ابھر کر سامنے

آجاتا تھا وہ اس کا سامنا کرنے سے کتراتی تھی یوں بھی وہ اس سے بہت کم مخاطب ہوتا تھا، بلکہ حقیقت تو یہ تھی کہ حرم خود محسوس کرتی تھی وہ اسے نظر انداز کرتا تھا، ہاں البتہ کبھی کبھار اسے لگتا وہ بڑی گہری اور جانچنے والی نگاہوں سے اس کا جائزہ لیتا تھا۔

شادی کے گیارہویں دن وہ دوسری بار اماں کی طرف گئی تھی، ہر طرح سے ان کی مکمل تسلی کرائی تھی کہ وہ بے حد خوش ہے، گھر میں سب ٹھیک ہے، رومان بہت اچھا ہے، اس کا بے حد خیال رکھتا ہے، خیال پر زور دیتے ہوئے اس کی آنکھوں میں نجانے کیوں ڈھیر سارا دھواں اتر آیا، اس کا اندر کرلانے لگا تھا، اس نے ارم کو دیکھا جسے سفیر کی محبتوں نے بے تحاشا حسین اور مغرور کر دیا تھا کہ اس پر نگاہ ہی نہ ٹھہرتی تھی اور اس کے اندر کچھ مزید سناٹے اتر آئے، وہ جیسے کچھوے کی مانند کچھ اور بھی اپنے خول میں سمٹ گئی۔

اسے لگتا وہ شہزادے کے ہاتھ آئی کنیز ہے جس پر وہ اپنی تیر اندازی کی مشق کرتا رہتا ہے اور ہر زہریلا تیر ہر سوئی جیسے اس کے دل کو اپنے زہر سے نیلا کرتی جا رہی تھی، وہ گھر واپس لوٹی تو پہلے سے زیادہ خاموش، افسردہ اور قنوطی ہو چکی تھی، خلاف توقع رومان گھر پہ ہی تھا اور اس سے زیادہ خلاف توقع لائبہ اس کی گود میں تھی یہ بھی رومان کا ہی حکم تھا کہ وہ لائبہ کے بغیر ہی اپنی والدہ کے گھر جائے۔

''السلام وعلیکم!'' اس نے آہستگی سے سلام کیا۔

رومان نے جواباً صرف سر ہلانے پہ اکتفا کیا، حرم کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔

''لائیں، اسے مجھے دیں، تنگ تو نہیں کیا اس نے؟'' اس نے ہینڈ بیگ ایک طرف ڈالتے ہوئے ہاتھ آگے بڑھائے، رومان نے کچھ کہے بنا اسے لائبہ تھما دی۔

حرم نے بے ساختہ اس کی پیشانی پہ بوسہ دیا اور اس نے نوٹ نہیں کیا کہ رومان نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا تھا۔

''زینت بی بی!'' اس نے ملازمہ کو پکارا، وہ فوراً حاضر خدمت ہو گئی۔

''آپ نے اس کو فیڈ ردیا؟''

''جی!'' اس نے سر ہلایا۔

''اچھا کھانے میں کیا ہے؟'' اس نے اگلا سوال داغا۔

''وہی جو آپ بتا کر گئی تھیں''۔

''ٹھیک ہے، کھانا لگواؤں؟'' اس نے زینت کی بات کا جواب دے کر رومان سے پوچھا۔

وہ بے نیازی سے چینل سرچنگ کرتا رہا حرم کو اپنے اعصاب کھینچتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔

''کھانا لگواؤں؟'' اس نے دوبارہ ہمت کر کے پوچھا۔

اس نے اس بار نظروں کا زاویہ بدل کر اسے دیکھا، نظروں سے نظریں ملیں اور اس کی آنکھوں کا سارا سرد پن حرم آصف کے اندر اتر گیا، اس نے آہستگی سے نفی میں سر ہلایا اور اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا، حرم ساکت بیٹھی اس کی پشت کو دیکھتی رہی۔

''کھانا لگاؤں بی بی!'' زینت نے اسے متوجہ کیا، اس نے انکار میں سر ہلایا اور لائبہ کے لے کر اٹھ گئی، رات میں لائبہ کو سلانے کے بعد وہ اپنے اور رومان کے کمرے کے درمیانی دروازے کو کھولتی اندر آ گئی، وہ بیڈ پر نیم دراز تھا اور ہاتھ میں موبائل تھا۔

دروازہ کھلنے کی آواز پر اس نے چونک کر نظریں دوڑائیں اور حرم کو دیکھ کر واپس پھیر لیں، حرم کے قدم سست پڑنے لگے۔

''آپ ناراض ہیں مجھ سے؟'' اس نے بیڈ کے قریب آتے ہوئے بہت آہستہ اور ڈرے ہوئے انداز میں پوچھا تھا۔

''کس بات پر؟'' اس نے چونک کر قدرے ناگواری سے پوچھا، حرم کا حوصلہ پست ہونے لگا۔

''مجھے لگا'' کہتے ہوئے اس کا دل ڈوب رہا تھا۔

''اندازے لگانا اچھی بات ہے مگر ہر بار ہر اندازہ ایکوریٹ رزلٹ دے یہ ضروری نہیں۔'' وہ چبھتے ہوئے لہجے میں بولا تھا۔

یہ واحد جملہ تھا جو ان کی گیارہ دن کی ازدواجی زندگی میں رومان نے بولا تھا اور اتنا ''لمبا'' تھا، کڑوا سیال پانی حرم کی آنکھوں میں جمع ہونے لگا۔

''پھر آپ ایسے بات کیوں کر رہے ہیں؟'' بہت ضبط کرنے کے باوجود اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے تھے، اس کے آنسوؤں نے رومان کو حیران کر دیا، اس نے فون سائیڈ پر رکھا اور سیدھا ہو گیا۔

''حرم پلیز! بیٹھیے یہاں پر۔'' اس نے ٹانگیں سمیٹ لیں تھیں۔

حرم آہستگی سے بیٹھ گئی، اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اور وہ بائیں ہاتھ کی پشت سے اپنے آنسو پونچھ رہی تھی۔

''حرم! ایکچولی میں اس شادی کے لیے تیار نہیں تھا، شزا نے مجھے فورس کیا اور میں نے ہاں کی کیونکہ اس گھر کو، لائبہ کو آپ کی ضرورت ہے۔'' وہ بہت تحمل سے بات کر رہا تھا جب حرم نے تیزی سے اس کی بات قطع کی۔

''لیکن آپ کو نہیں تھی۔'' اس کے انداز میں یقین تھا۔

''میں نے ایسا نہیں کہا۔'' رومان نے بھنویں اچکا کر فوراً اسے ٹوکا، وہ خاموشی سے فرش کو گھورتی رہی۔

''اب اگر میں آپ سے یہ پوچھوں کہ آپ نے ہاں کیوں کی تھی تو.....؟'' رومان کا لہجہ طنزیہ تھا۔

حرم کے دل میں جیسے کسی نے برچھی اتار دی تھی، اس نے زرد رنگت اور کپکپاتے لبوں کے ساتھ اسے دیکھا اور تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی مگر اتنی ہی تیزی سے رومان نے اسے ہاتھ کھینچ کر واپس بٹھا دیا تھا۔

''آپ میری بات کا جواب دیے بغیر نہیں جا سکتیں۔'' اس کا لہجہ سرد تھا۔

''کیا جاننے کی خواہش ہے آپ کو؟ میں نے تو اسی طرح ہاں کی تھی جیسے ہر لڑکی کرتی ہے۔'' وہ بے بسی سے کہتی رونے لگی۔

''کسی بھی لڑکی کی یہ خواہش نہیں ہوتی کہ وہ ایسے مرد کے ساتھ شادی کرے جو پہلے سے شادی شدہ ہو اور ایک بچی کا باپ ہو؟'' وہ بولا تھا مگر نہ اس کی آواز بلند ہوئی تھی نہ لہجہ بدلا تھا، صرف ایک کھوج تھی، حرم کا رونا بتدریج بڑھتا گیا، رومان نے اضطراب سے اسے دیکھا۔

''آپ رو کر کیا ثابت کرنا چاہ رہی ہیں؟'' وہ جھلایا تھا۔

جواباً وہ کچھ نہیں بولی تھی، دونوں کے درمیان خاموشی کا ایک اذیت ناک وقفہ آ گیا جس میں حرم کی سسکیاں گونج رہی تھیں۔

''حرم پلیز!'' اس کے لہجے میں تپش آ گئی۔ وہ یکدم تیزی سے اٹھی اور بھاگتی ہوئی درمیانی دروازہ پار کر گئی اس کے پیچھے دروازہ بند ہو گیا، رومان پرسوچ نظروں سے بند دروازے

کو دیکھتا رہا، حرم کا رویہ اس کے لیے حیرت انگیز تھا۔

☆☆☆

حسان کافی دنوں بعد اس کی طرف آیا تھا، حرم کی طرف سے اسے بڑا اچھا ریسپشن ملا تھا، قیمتی مگر جدید تراش خراش کے سوٹ میں وہ سلیقے سے دوپٹہ اوڑھے بڑی سنجیدہ دکھائی دیتی تھی، حسان نا چاہتے ہوئے بھی اسے نوٹس کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

وہ دونوں چائے پیتے ہوئے ایک فائل کو ڈسکس کر رہے تھے جب رومان کے سیل پر ارم کی کال آنے لگی، اس نے سیل کو ایک نظر دیکھا اور کال پک کرنے کی بجائے بلند آواز میں حرم کو پکارا، کچھ ہی دیر بعد وہ اندر آ گئی۔

''جی آپ نے بلایا؟'' وہ آگے بڑھی۔

''آپ کا فون ہے۔'' اس نے سیل اس کی طرف بڑھا دیا، حرم نے کسی قدر حیرانی سے سیل کی جلتی بجھتی اسکرین دیکھی مگر ارم کا نمبر پہنچان کر اس نے سمجھنے والے انداز میں سر ہلایا اور فون لیے تیزی سے باہر کی سمت بڑھ گئی، حسان نے بغور اس کو نوٹس کیا تھا، رومان نے اس کے اس طرح دیکھنے پر بھنویں اچکا کر اسے متوجہ کیا۔

''ایک بات بتاؤں رومان؟'' اس کے انداز میں تحقیق تھی۔

''پوچھو؟''

''سارا بھول گئیں تمہیں؟'' اس کا انداز بڑا سادہ سا تھا، رومان کے چہرے پر اذیت کا سایہ لہریا تھا۔

''کیا ایسا ممکن ہے؟'' اس نے الٹا سوال کیا، حسان خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

''حرم کیسی لگی تمہیں؟''

کس حوالے سے؟'' وہ چونکا۔

''ہر حوالے سے؟''

''اچھی ہیں۔'' اس نے ایک جملے میں نمٹایا۔

''اتنا احترام تم نے کبھی سارا کا نہیں کیا۔'' حسان کے انداز میں چبھن تھی۔

''تو.....؟'' رومان کا انداز سپاٹ تھا، حسان یکلخت مسکرا دیا۔

''ریلیشن کیسا ہے آپس میں؟'' اس کا سوال بڑا کاٹ دار تھا، رومان کے چہرے پر

ناگواری بکھری تھی۔

''تم کیوں جاننا چاہتے ہو؟''

''تم نہیں بتانا چاہتے؟'' حسان نے اسے گھورا۔

''آخر تم انوسٹی گیشن کیوں کر رہے ہو؟'' وہ جھلا گیا۔

''پلیز مجھے بتاؤ تم اتنے آرٹسٹک مزاج انسان ہو کہ ناپسندیدہ شخص کے ساتھ چائے بھی نہیں پی سکتے اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ہر عورت، مرد کو ایک خاص رویے اور خاص انداز سے متاثر کرتی ہے، میں جاننا چاہتا ہوں آخر حرم آصف نے تمہیں کس رویے سے متاثر کیا ہے؟''

وہ بحث پہ آمادہ تھا۔

''وہ لائبہ کا خیال بہت اچھی طرح رکھتی ہے۔''

اس نے بات ختم کر دی، حسان یکدم کھلکھلا کر ہنس دیا۔

''تمہیں پتا ہے تمہاری اس بات نے حرم کو کس مقام پہ لا کھڑا کیا ہے؟'' وہ ہنسی روک کر طنز اُبولا۔

''کیا مطلب؟'' رومان کے ماتھے پر شکن آ گئی۔

''جو حیثیت اس کی تم مجھے بتا رہے ہوں اس کے مطابق وہ ''لائبہ کی گورنس'' ہی بنتی ہے۔ حسان نے جتایا۔

''حسان! فضول باتیں مت کرو۔'' وہ خفا ہوا۔

''فضول؟ ارے نہیں میرے دوست یہ ہی تو عقل کی بات ہے، ورنہ خود ہی بتاؤ جب وہ لائبہ کی دیکھ بھال اچھی کرتی ہے اور تمہیں اسی بات سے مطلب ہے اور سارا کو تم نہیں بھولے تو اس حرم آصف کا مقام تو یہی ہوا نا؟'' حسان فتح مندی سے بولا۔

''ہاں ٹھیک کہا تم نے، شی از جسٹ اے گورنس۔'' وہ اکتاہٹ سے شانے جھٹک کر بولا۔

لاؤنج کے دروازے کے فریم میں کھڑی حرم کے ہاتھوں موبائل چھوٹا اور اس کے پارٹس کھل کر بکھر گئے، دونوں نفوس نے چونک کر دیکھا، حرم کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا اور آنکھیں پانیوں سے بھرتی جا رہی تھیں، یکلخت وہ تیزی سے مڑی اور باہر نکل گئی۔

☆☆☆

یونہی ہنسی ہنسی میں ہم

دلوں سے کھیل جاتے ہیں
کوئی چھوٹی سی تیکھی بات
کوئی چبھتا ہوا جملہ
کوئی زہر آلود لہجہ
کوئی بے ضرر سی ذو معنی بات
سننے والے کے دل پر گھاؤ لگا جاتی ہے
اور.....!
یونہی ہنسی ہنسی میں ہم
دلوں سے کھیل جاتے ہیں

''درد، کا دائرہ تھا کہ بڑھتا ہی جاتا تھا، ''اذیت'' تھی کہ پھیلتی ہی جاتی تھی، جاں کو نچوڑتی اذیت اور رگوں کو نوچتا درد، وہ جیسے سراپا اذیت بنی ہوئی تھی اور رات تھی کہ خنک سے خنک تر ہوتی جا رہی تھی، وہ لان کے نسبتاً تاریک حصے میں گھٹنوں پر سر رکھے بیٹھی تھی جب قدموں کی چاپ سنائی دی، خوشبو نے بتایا کہ آنے والا رومان ہی تھا۔

''حرم! ادھر کیا کر رہی ہیں آپ؟ اٹھیے، سردی بڑھ رہی ہے۔'' اس نے حکم دیا۔

وہ گھٹنوں پر ہاتھ جماتی اٹھنے لگی مگر سرد موسم اور کافی دیر سے ایک ہی جگہ بیٹھے رہنے سے فوری طور پر مسلز نے ساتھ دینے سے انکار کر دیا، اس سے پہلے کہ وہ لڑکھڑا کر گرتی، رومان کے ہاتھ نے تیزی سے اسے سہارا دیا، وہ سیدھی کھڑی ہو گئی اور پھر غیر محسوس طریقے سے بازو چھڑاتی آگے بڑھ گئی۔

رومان نے اسے تاریکی میں کسی ہیولے کی مانند آگے بڑھتا دیکھا اور خود بھی اس کے پیچھے چلا آیا، وہ سیدھی اپنے کمرے میں چلی گئی تھی، رومان چند لمحے کچھ سوچتا رہا پھر دروازے پر دستک دیتا اندر آ گیا، حرم وارڈ روب کے آگے کھڑی تھی، وہ اس کے نزدیک چلا آیا۔

''آپ ناراض ہیں؟'' وہ جیسے سوال نما جواب دے رہا تھا، حرم کے ہاتھ بیڈ کی چادر درست کرتے ساکت رہ گئے، اس نے زخمی نظروں سے اسے دیکھا، رومان کے اندر شرمندگی گہری ہو گئی۔

''وہ سب صرف ایک Reflex action تھا، ورنہ میرے ذہن میں ایسا کچھ نہیں

تھا....." وہ مقدور بھر اپنی صفائی پیش کر رہا تھا، حرم نے یکلخت بھڑک کر اس کی بات کاٹ دی۔

"وہ سب صرف ایک Reflex action نہیں تھا وہ آپ کی حقیقی سوچ تھی جس کا ثبوت آپ کا رویہ ہے۔"

"کیا مطلب؟" وہ چونکا۔

"آپ کے رویے نے تو مجھے اول دن ہی میری حیثیت باور کرادی تھی اب آپ نے زبان سے کہہ دیا تو کیا فرق پڑتا ہے۔" وہ خود ترسی میں مبتلا تھی۔

"ایسا نہیں ہے حرم۔" اس کے ماتھے پہ شکن آگئی۔

"ایسا ہی ہے، شادی کے دن کے سوا کیا آپ کبھی میرے پاس آئے؟ مجھے اپنے پاس بلایا، نہیں بالکل نہیں، تو اس سے وہی اخذ ہوتا ہے جو میں آپ کو بتا چکی ہوں اور وہ ایک رات..... وہ بھی عجیب رات تھی، مجبوری کی اذیت تو جیسے آپ کے چہرے پر درج تھی ورنہ آپ کا بس چلتا تو مجھے اٹھا کر کمرے سے باہر پھینکتے۔" وہ بے رحمی سے تجزیہ کر رہی تھی۔

رومان کا رنگ بدل گیا اور ماتھے کی شکنیں گہری ہوتی گئیں، اس نے درشتی سے حرم کی بات کاٹی۔

"جسٹ شٹ اپ۔"

حرم نے ایک دم خاموش ہو کر اسے دیکھا اور لب بھینچ لیے، وہ سرد نظروں سے اسے گھور رہا تھا، حرم کے اندر تلخی مزید گہری ہونے لگی، اس نے ہاتھ بڑھا کر ہینگر کھینچ اور باتھ روم کی سمت بڑھ گئی، جب وہ چینج کر کے لوٹی تو وہ کمرے میں موجود نہیں تھا، حرم کی اذیت میں مزید اضافہ ہوا تھا۔

"فیصلے کی غلطی" کا احساس بڑی شدت سے اسے ستانے لگا تھا اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ وہ اپنے فیصلے پر پچھتائے گی اور اتنی جلدی کا تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا، اسے ارم کی باتیں یاد آرہی تھیں، کتنا سمجھایا تھا اس نے، جب وہ اماں کے ساتھ رومان سے مل کر آئی تھی۔

"یہ Aristocracy بڑی ظالم ہوتی ہے حرم خدا نہ کرے تجھے پچھتانا پڑے مگر ایک بات یاد رکھنا، ہم لوگ نہ ان جیسے بن سکتے ہیں اور نہ انہیں اپنا بنا سکتے ہیں، تمہیں اندازہ نہیں ہے تم کیا کر رہی ہو؟ رومان لاشاری جیسا مرد جو اتنا ہینڈسم پلس Rich ہے اسے لڑکیوں کی کمی یقیناً نہیں ہوگی مگر لازماً وہ بہن کے آگے مجبور ہو گیا ہوگا، مگر میں تمہیں ایک بات سمجھاؤں، اس

سے امیدیں وابستہ مت کرنا، ورنہ زندگی بہت مشکل ہو جائے گی۔" اسے ارم کی بات لفظ بہ لفظ یاد آگئی تھی، آنسوؤں کی روانی میں یکدم مزید اضافہ ہوا تھا، یکلخت سوئی ہوئی لائبہ رونے لگی اس نے بمشکل دکھتے سر سمیت اسے اٹھایا اور لے کر کمرے میں ٹہل کر اسے بہلانے لگی، مگر وہ اور زور سے رونے لگی، حرم نے تھک ہار کر اسے سینے میں بھینچا۔

ایسا ممکن ہی نہیں تھا کہ صرف ایک دیوار کے فرق سے موجود ساتھ والے کمرے میں سوئے رومان تک آواز نہ جاتی، وہ ابھی کچی نیند میں تھا، آنکھیں کھول کر چند لمحے گومگو کی کیفیت میں پڑا رہا پھر اٹھ کر تیزی سے درمیانی دروازہ کھول کر حرم کے کمرے میں چلا آیا، بڑا ہی عجیب منظر تھا، سامنے ہی وہ بیٹھی تھی زمین پہ، لائبہ اس کے سینے سے لگی تھی اور دونوں زور و شور سے رونے میں مصروف تھیں، وہ تیزی سے آگے آیا اور جھپٹنے والے انداز میں اس سے لائبہ کو چھین لیا، حرم نے پھٹی ہوئی نظروں سے اپنے خالی بازوؤں کو دیکھا اور سر گھٹنوں پہ رکھتے ہوئے دونوں بازو ٹانگوں کے گرد لپیٹ لئے، اور لائبہ کا رونا بتدریج مدھم پڑتا گیا اور پھر شاید وہ سو گئی، حرم کو اس کی آواز آنا بند ہو چکی تھی، اس نے سر اٹھا کر دیکھا وہ لائبہ کو بیڈ پر لٹا رہا تھا، سیدھے ہوتے ہوئے دونوں کی نظر ملی، حرم کو لگا یہ آنکھیں بڑی تھکی ہوئیں اور افسردہ تھیں، وہ سیاہ شرٹ اور ٹراؤزر میں ملبوس تھا، اس کے براؤن اور سنہری بال ماتھے پہ بکھرے تھے سفید رنگ میں ہلکی سی تمتماہٹ تھی، سیاہ شرٹ میں اس کے چوڑے شانے نمایاں نظر آرہے تھے، وہ اس کی طرف بڑھ آیا، آگے آکر اس نے حرم کو بازو سے تھاما اور سیدھا کھڑا کر دیا، حرم نے کوئی مزاحمت نہیں کی، وہ اس گھڑی جیسے اس کی بھوری آنکھوں کا معمول تھی، وہ اس کو اسی طرح اپنے کمرے میں لے آیا تھا، درمیانی دروازہ اس نے کھلا چھوڑ دیا تھا، اسے بیڈ پر بٹھا کر وہ گلاس میں پانی ڈالنے لگا، پھر اس نے گلاس حرم کی طرف بڑھا دیا، حرم نے ہاتھ آگے نہیں بڑھایا، رومان نے زبردستی اس کے لبوں سے گلاس لگایا، دو گھونٹ پینے کے بعد اس نے گلاس ہٹا دیا، رومان اس پر کمبل درست کر رہا تھا، لائٹ بجھا کر وہ اٹھنے لگا تھا جب حرم نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"مجھے نیند نہیں آرہی۔" اس کے الفاظ تھے یا بے بسی اور کرب میں لپٹی خونچکاں حکایتیں، رومان کا کلیجہ ہل کر رہ گیا، وہ اس کے قریب لیٹ گیا، بہت فراخدلی کے ساتھ اس نے دایاں بازو پھیلایا اور حرم کو قریب کر لیا یوں کہ اس کے شانے پر حرم کا سر آگیا، وہ آہستگی سے اس کے بالوں میں انگلیاں چلانے لگا، حرم یک ٹک اسے دیکھ رہی تھی ہلکی سی نیلگوں روشنی میں وہ اس

کے بہت قریب تھا، یوں کہ وہ اس کی مہک محسوس کر سکتی تھی، اس نے ایک لمبی سانس کھینچ کر اس کی خوشبو سے خود کو مہکایا اور آنکھیں بند کر لیں۔

''میں پچھتانا نہیں چاہتی رومان!'' اس کے لبوں سے سسکی سی نکلی تھی۔

''کس بات پر؟'' رومان کا ہاتھ رک گیا۔

''آپ سے شادی کے فیصلے پر، ارم نے بہت ڈرایا تھا مجھے۔'' وہ اس کی شرٹ کے کالر کو مضبوطی سے جکڑے ہوئے تھی۔

''کیوں؟'' رومان نے اس کی بھیگی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

''وہ پتا نہیں کیسی باتیں کرتی تھی، عجیب عجیب..... آپ مجھے کچھ نہ دیں مگر.....'' وہ کہہ رہی تھی، رومان نے اس کی بات قطع کر دی۔

''کیسی باتیں کرتی تھی وہ؟'' رومان نے اسے نزدیک کر لیا، حرم سے سانس لینا مشکل ہو رہا تھا وہ ڈر رہی تھی اگر وہ اونچی آواز سے بولے گی اور سانس لے گی تو یہ خواب بکھر جائے گا۔

''وہ..... وہ کہتی تھی Aristocracy بڑی ظالم ہوتی ہے وہ تمہیں بیوی نہیں آیا بنا کے لے جا رہا ہے ورنہ اسے کیا کمی لڑکیوں کی؟'' وہ رک رک کر کہہ رہی تھی۔

''پھر؟'' ''پھر بھی میں نے کہا مجھے یہ شادی لازماً کرنی ہے۔''

''کیوں؟''

''کیوں کہ میں تھک چکی تھی اس معاشرے سے لوگوں کے رویوں سے۔'' اس نے بات ادھوری چھوڑ دی اس کی نظر رومان کی گردن پر تھی، اس کا دل چاہا وہ بے اختیار اسے چھوئے۔

''ارم کہتی تھی میں مادیت پرست ہوں۔''

اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

''میں نے کہا، اس میں مادیت پرستی کہاں سے آ گئی،، میں تھک چکی ہوں ریجیکشن کا عذاب سہہ سہہ کر، لوگوں کو میرے ساتھ اور بھی بہت کچھ چاہیے تھا، لمبا چوڑا جہیز، جو میری اماں اپنی غربت کے ہاتھوں مجبور و بے بس دے نہیں سکتی تھی، جب آپ کا پرپوزل آیا تو میں نے صرف یہی سوچا کہ آپ کی کوئی ڈیمانڈ نہیں ہے، مجھے اور کچھ نہیں چاہیے تھا، مجھے آسائشیں نہیں چاہیے تھیں، مجھے دولت کے انبار نہیں چاہیے تھے، مجھے صرف عزت چاہیے تھی، رومان صرف

محبت چاہیے تھی۔'' وہ اب براہ راست اس کی بھوری آنکھوں میں دیکھ رہی تھی جن میں بے یقینی تیر رہی تھی۔

''آپ..... ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں کیا آپ کو لگتا ہے کوئی اور وجہ ہو سکتی ہے، اگر ایسا ہے تو پلیز ایسا کچھ مت سوچیے گا، میرے جیسے بیک گراؤنڈ اور شکل صورت کے ساتھ آپ سے شادی کرنے کی اور کون سی وجہ ہو سکتی ہے Obviously اپنے ماحول سے فرار اور مجبوری کی ایک لمبی قطار.....'' وہ طویل سانس لے کر بولی، وہ خاموشی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''کیا پیسہ اتنا میٹر کرتا ہے؟'' اسے حسان سے اپنی گفتگو یاد آئی حرم نے ابھی تک اس سے کسی قسم کی ڈیمانڈ نہیں کی تھی، شزا نے اس کے لیے شادی کے لیے کچھ شاپنگ کی تھی اور کچھ وہ اپنے گھر سے لے کر آئی تھی، اسی سے کام چل رہا تھا۔

دوسری طرف وہ لائبہ کو بھی بہت اچھے طریقے سے سنبھال رہی تھی، لائبہ اس سے بہت زیادہ مانوس ہو چکی تھی، کیا کوئی گلہ بچا تھا؟ رومان نے سوچا، پھر نفی میں پا کر اسے دیکھا جس کی آنکھوں میں امید و یاس کے دیے جل رہے تھے پھر بڑی بھرپور آمادگی اور محبت سے اسے خود میں سمیٹ لیا، اس کی متورم سوجی آنکھوں کو چوما اور اس کے بکھرے بال سمیٹ دیے اور پھر حرم نے دیکھا اس کے چہرے پر تمام تر خول تڑخاتی مسکراہٹ نمودار ہوئی، سچی مسکراہٹ، ایسی مسکراہٹ جس پر تخت وار دیے جائیں، اس نے بے ساختہ اس مسکراہٹ کے دائمی ہونے کی دعا مانگی تھی۔

☆☆☆

اگلے دن بڑی خوشگوار سنہری دھوپ نکلی تھی، وہ لائبہ کو لے کر لان میں بیٹھی تھی جب شزا آ گئی۔

''اف حرم، سوری ڈیئر میں کچھ بزی رہی آ نہیں سکی، مگر تم نے بھی تو جیسے نہ آنے کی قسم اٹھا رکھی ہے۔'' وہ بیگ ٹیبل پر رکھ کر بے تھکان بولتی گئی۔

''ایسا نہیں ہے شزا! بس آپ کو پتا ہے آپ کے بھائی کتنا بزی ہوتے ہیں۔'' اس نے مسکرا کر یقین دہانی کروائی، شزا نے سمجھنے والے انداز میں سر ہلا دیا۔

''اور باقی سب ٹھیک ہے؟ لائبہ سیٹ ہے تمہارے ساتھ؟''

''اللہ کا شکر ہے سب ٹھیک ہے، لائبہ کو آپ دیکھ لیں کتنی سیٹ ہے۔'' اس نے مسکرا

کر کہا، لہجے میں گہری طمانیت تھی۔

''ہاں وہ تو واقعی نظر آ رہا ہے، اچھا سنو اسے زینت بی بی کے پاس چھوڑ دو، چلو شاپنگ پر چلتے ہیں۔'' اس نے لاپرواہی سے کہا۔

''نہیں میں..... میں کیا کروں گی؟'' وہ بوکھلا گئی۔

''ارے! شاپنگ کا کیا کرتے ہیں بھئی، چلو اٹھو۔'' اس نے زور دیا۔

''میں کیسے جا سکتی ہوں لائبہ؟''

''کیوں نہیں جا سکتی اور لائبہ بتایا تو ہے گھر میں ہی رہے گی۔'' اس نے فیصلہ صادر کیا۔

''ٹھیک ہے مگر آپ اس کے پاپا سے پوچھ لیں۔'' حرم نے کہا۔

''ہاں یہ ٹھیک ہے۔'' شزا نے سر ہلایا اور رومان کو کال کرنے لگی، کچھ دیر بعد فون اٹھا لیا گیا اور شزا زور و شور سے اس سے بات کرنے لگی۔

''بس مجھے کچھ نہیں پتا، آپ حرم سے کہیں کہ وہ میرے ساتھ چلے۔''

''اچھا حرم سے بات کرواؤں، اچھا ٹھیک ہے۔'' اس نے سیل حرم کی طرف بڑھا دیا، حرم نے کنفیوژ سے انداز میں فون لے لیا۔

''السلام وعلیکم!'' اس نے یوں نظر جھکائی تھی جیسے وہ سامنے بیٹھا ہو۔

''وعلیکم السلام حرم! ایسا ہے کہ آپ شزا کے ساتھ چلی جائیں اور.....'' حرم نے اس کی بات کاٹی۔

''گھر میں کیسے؟''

''میں آپ کی پرابلم سمجھ رہا ہوں، آپ میری وارڈ روب کے سینٹرل ڈرائر سے کریڈٹ کارڈ لے لیں، کیش بھی ہے وہاں، جو بھی آپ پسند کریں۔'' وہ تیزی سے کہتا جا رہا تھا، غالباً وہ مصروف تھا۔

''نہیں میں نہیں کر سکتی میں کیسے.....'' وہ بے حد گھبرا گئی۔

''میں آپ سے کہہ رہا ہوں نا۔'' اس کا لہجہ تحکم بھرا تھا، اسی دوران شزا لائبہ کو لے کر اندر چلی گئی، حرم کو تسلی سے بات کرنے کا موقع مل گیا۔

''پلیز میں نہیں کر سکتی، میں نے کبھی آپ کے ڈرائرز نہیں کھولے اور شاپنگ کا کیا کروں گی میں؟ سب کچھ تو ہے میرے پاس۔'' وہ مدھم لہجے میں بولی۔

''حرم! ضد مت کریں، جیسا میں کہہ رہا ہوں ویسا کر لیجیے۔'' رومان نے سکون بھرا سانس لیتے ہوئے فون رکھ دیا، وہ تھوڑی دیر وہیں بیٹھی رہی پھر اٹھ کر اندر چلی گئی۔

کچھ دیر بعد وہ چینج کر کے اس کے وارڈ روب کی سمت بڑی تو بے حد گھبرائی ہوئی اور کنفیوژ تھی، اس نے سینٹرل ڈرائر کھولا تو وہاں بے شمار فائلز، کاغذات، کارڈز، البم اور کیش موجود تھا، اس نے پہلے روپے لینے چاہے پھر اس کی ہدایت کے برعکس کریڈٹ کارڈز لے لیے اور باہر آ گئی۔

شزا نے اسے حقیقی معنوں میں تھکا مارا تھا، اس نے اتنی ڈھیر ساری شاپنگ کی تھی کہ اس کے حساب سے آرام سے دو تین سال گزر سکتے تھے اس دوران حرم کی رائے کا اس نے بھرپور خیال رکھا تھا، حرم کی آنکھوں نے جیسے ایک نئے جہاں کی سیر کی تھی، نت نئے ملبوسات، جوتے، جیولری اور بے شمار الم غلم و پتا نہیں کیا کیا اٹھا لائیں تھیں، اسے ڈراپ کرنے کے بعد شزا تو اپنے گھر سدھاری اور وہ تھکی ہوئی بیڈ روم میں آ گئی، سب سے پہلے اس نے لائبہ کو گود میں سمیٹا اور ڈھیر سارا پیار کیا پھر زینت کو بلا کر چائے لانے کا کہا اور اٹھ کر چیزیں وارڈ روب میں رکھنے لگی، چائے پیتے ہوئے اس نے اپنے اندر پھیلی ہوئی خوشی کو محسوس کیا اور پھر بڑی دیر غور کرنے کے بعد اسے سمجھ آئی کہ یہ خوشی ڈھیر ساری شاپنگ کرنے کی نہیں تھی، قطعاً نہیں تھی، یہ رومان کے بدلے ہوئے رویے کی خوشی تھی، رومان رات آٹھ بجے کے قریب آیا تھا، حرم نے اسے چمکدار آنکھوں اور مسکراتے لبوں کے ساتھ ریسو کیا تھا، وہ چینج کر کے ڈنر ٹیبل پر آیا تو حرم بھی آ چکی تھی۔

''ہو گئی شاپنگ؟'' اس نے کھانا کھاتے ہوئے استفسار کیا۔

''جی'' اس نے آہستگی سے کہا۔

وہ مزید کچھ بولے بنا کھانا کھاتا رہا، حرم کی نظریں اس کے ہاتھوں پر تھیں پھر وہاں سے سفر کرتی ہوئیں اس کے لبوں تک پھر اس کی آنکھوں پر جو جھکی ہوئی تھیں پھر اس کے سنہرے اور بھورے بالوں پر جو ماتھے پہ گرے ہوئے تھے۔

''کیا اس سے زیادہ خوبصورت مرد کوئی ہو سکتا ہے۔'' اس نے بڑھتی دھڑکنوں کے ساتھ سوچا اور یہ پہلی بار نہیں تھا وہ تو ہمیشہ اسے دیکھ کر یہی سوچتی تھی، اس کا بات کرنا، ہنسنا، چلنا، اٹھنا، بیٹھنا، یہاں تک کہ کھانا کھانا بھی اسے ہر چیز مکمل لگتی تھی اور حرم آصف کو اس کی ہر بات اپنی طرف کھینچتی تھی کھانا کھانے کے بعد وہ اپنے بیڈ روم میں چلا آیا جبکہ وہ کچن سمیٹنے میں مگن ہو

گئی، وہ واپس آئی تو زینت لائبہ کو سلا چکی تھیں، اس نے انہیں جانے کا کہا اور خود اپنے کمرے کا دروازہ کھولتی اندر آ گئی، وہ اپنی کمپیوٹر ٹیبل پر براجمان تھا، اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور اس کے لبوں پر ایک بہت ہلکی سی خیر مقدمی مسکراہٹ آ گئی، حرم جیسے نہال سی ہو گئی، وہ کی بورڈ پر ہاتھ چلا رہا تھا، حرم اس کی چیئر کے پیچھے آ کر کھڑی ہو گئی۔

''اتنا کام کیوں کرتے ہیں آپ؟'' اس کے انداز میں تفکر بھرا شکوہ تھا۔

''آپ کے لیے لائبہ کے لیے۔'' وہ آہستگی سے بولا تھا

اس کے جواب نے حرم کو کچھ دیر کے لیے بالکل خاموش کروا دیا تھا، پھر وہ تھوڑا آگے بڑھی اور اس کے شانے پہ ہاتھ رکھ دیا۔

''اتنا کام مت کیا کریں۔'' اس نے بہت لاڈ سے جیسے فرمائش کی، رومان کے چلتے ہاتھ ساکت ہو گئے، اس نے کمپیوٹر شٹ ڈاؤن کر دیا اور چیئر دھکیل کر اٹھ کھڑا ہوا۔

''اوکے، آپ نے مجھے اپنی شاپنگ تو دکھائی ہی نہیں؟'' وہ بولا، حرم نے بے پناہ خوشی سے اسے دیکھا۔

''کیوں نہیں، آئیں میرے ساتھ۔'' رومان اس کے ساتھ بڑھ گیا، وہ آ کے بیڈ پر بیٹھ گیا، وہ وارڈ روب کے سامنے کھڑی ہو گئی، رومان نے دیکھا اس نے لائبہ کو بے بی کاٹ میں نہیں لٹایا تھا بلکہ وہ بیڈ پر سوئی ہوئی تھی، اس نے جھک کر بیٹی کی پیشانی پر بوسہ دیا۔

''لائبہ آپ کو زیادہ تنگ تو نہیں کرتی؟'' وہ پوچھنے لگا۔

ہینگر کھینچتی حرم نے گردن موڑ کر اسے دیکھا اور بے ساختہ مسکرا دی۔

''نہیں اور اگر کرتی بھی ہے تو آپ کو کیا اعتراض ہے؟ یہ ہمارا ماں بیٹی کا معاملہ ہے۔'' وہ شوخی سے بولی، وہ آہستہ سے ہنس دیا۔

وہ اسے شاپنگ دکھانے لگی، رومان نے دیکھا اس کے چہرے پر بچوں جیسی خوشی تھی حالانکہ ہر ایک چیز کے بعد اگلی دو چیزیں لائبہ کی تھیں، وہ چیزیں دیکھ رہا تھا اور حرم اسے دیکھ رہی تھی۔

''ایک بات بتائیں حرم؟'' وہ اسی طرح مصروف سا بولا۔

''جی'' وہ چونکی۔

''آپ مجھے اتنا نوٹ کیوں کرتی ہیں؟'' اس کے لاپرواہ سے سوال نے حرم کو ساکت

سا کر دیا۔

''کک..... کیا مطلب؟'' وہ بوکھلا گئی، رومان نے نظریں اٹھا کر براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟'' وہ معنی خیزی سے بولا، ناسمجھی کا تاثر دیتے ہوئے بھی حرم کا رنگ سرخ ہو گیا۔

''میں سمجھی نہیں۔'' اس نے کہا۔

''چلیں مجھے یہ بتائیں کیا ایج ہے آپ کی؟'' وہ اس کے سول پر حیران ہوئی۔

''تیئس سال۔''

''رائٹ، آپ کو پتا ہے آپ مجھ سے کتنی چھوٹی ہیں؟'' وہ بظاہر سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا، اس نے نفری میں سر ہلا دیا۔

''گیارہ سال چھوٹی ہیں آپ مجھ سے، اس سال میں چونتیس برس کا ہو جاؤں گا۔

''پھر بھی آپ مجھے آپ کہتے ہیں۔'' وہ بے ساختہ بولی۔

''آپ نے ہی تو کہا تھا آپ کو عزت چاہیے اور یہ احترام کا ایک انداز ہے۔'' دھیمے لہجے میں کہتا وہ اسے لاجواب کر گیا، وہ چپ ہو کر بیڈ شیٹ پر کچھ کریدنے لگی۔

''اچھی شاپنگ ہے، چلتا ہوں، اگر ایک کپ کافی مل جائے تو.....؟'' وہ اٹھ گیا، سوال درمیان میں ہی رہ گیا تھا۔

''جی..... میں بناتی ہوں۔'' وہ چیزیں سمیٹنے لگی۔

وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا، چیزیں سمیٹنے کے بعد وہ کچن کی طرف بڑھ گئی، وہ کافی بنا کے لوٹی تو وہ سلائیڈنگ ڈور کھولے کھڑا تھا اس نے مگ اسے تھما دیا اور خود بھی وہیں کھڑی ہو گئی، موسم بے حد سرد تھا، تیز اور خنک ہوا کے تھپیڑے اسے کپکپانے پر مجبور کر گئے، اس نے رومان کو دیکھا، براؤن گرم شلوار سوٹ میں وہ بہت سکون سے کھڑا تھا۔

''آپ کو سارا سے بہت محبت تھی؟'' دفعتاً وہ بولی، رومان نے جھٹکے سے چہرہ موڑ کر اسے دیکھا، حرم اس کے تاثرات نہیں جان سکی، وہ اندھیرے میں تھا۔

''آپ کیوں جاننا چاہتی ہیں؟'' اس کا لہجہ مرتعش تھا۔

''میں نے سوچا شاید آپ کے دل میں مجھے بھی تھوڑی سی جگہ مل جائے؟'' اس کے لہجے

میں حسرت تھی۔

''کھنڈروں میں جگہ نہیں ڈھونڈتے حرم۔'' اس کا لہجہ جذبات سے عاری تھا، حرم کپکپا اٹھی، شاید سردی بڑھ رہی تھی۔

''یہاں آیئے میرے پاس۔'' وہ اس سے مخاطب ہوا تھا، حرم وہیں جمی کھڑی رہی۔

''میں آپ سے کہہ رہا ہوں۔'' اس نے دایاں بازو کھول کر اسے متوجہ کیا، وہ میکانکی انداز میں اس کے نزدیک آ گئی۔

رومان نے اسے خود سے لگا لیا، حرم کے گال بے حد سرد ہو رہے تھے، رومان کے گریبان کے بٹن کھلے ہونے کی وجہ اس کا بایاں گال اس کے گرم سینے سے ٹکرایا اسے عجیب سا سکون محسوس ہوا تھا اس نے بے اختیار آنکھیں بند کر کے دونوں بازو رومان کی پشت کے گرد لپیٹ لیے، وہ اپنے بالوں پر اس کے لبوں کا لمس محسوس کر رہی تھی، اس کے اندر طمانیت پھیلتی جا رہی تھی۔

''میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ دوبارہ اس موضوع پر کوئی بات نہیں کریں گی۔'' وہ پتا نہیں گزارش کر رہا تھا یا حکم دے رہا تھا، حرم کو سمجھ نہیں آیا تھا، مگر اسے جاننے کی ضرورت بھی کیا تھی، اس کے لیے یہی کافی تھا کہ ''وہ'' کہہ رہا تھا۔

اک میں ہی نہیں جرم محبت کا خطا وار
ہلکا سا تبسم بھی تو شامل تھا ادھر سے!

☆☆☆

ارم کا فون آیا ہوا تھا، اس کے پاس ڈھیر تھا باتوں کا، وہ بنا رکے بولے جا رہی تھی، رومان آفس جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا، گاہے بگاہے اسے بھی دیکھتا تھا، وہ چینج کرنے کے لیے ڈریسنگ روم میں گیا تو حرم بھی اتنی دیر خود پر ضبط کے بندھ باندھے بیٹھی تھی فوراً بولنے لگی۔

''حرم! مجھے لگ رہا ہے تم بہت خوش ہو، خدا تمہیں ہمیشہ خوش رکھے مگر بتاؤ تو بات کیا ہے؟'' ارم بھی حیران سی تھی۔

''میں تمہیں کیا بتاؤں ارم! وہ بہت اچھا ہے، اتنا کہ..... بس، تم نے دیکھا ہے نا اسے، میرے خدا..... کتنا خوبصورت ہے، مجھے لگتا ہے اگر میں اسے نظر بھر کے دیکھوں گی تو اسے نظر ہی نہ لگ جائے، بہت کم ہنستا ہے وہ مگر جب بھی مسکراتا ہے ناں میرا دل چاہتا ہے میں اس کا

صدقہ اتاروں، کہیں اسے نظر نہ لگ جائے، میں..... شاید بیان ہی نہیں کر سکتی اپنے احساسات، وہ مجھے چھوتا ہے تو مجھے لگتا ہے میں اس دنیا کی سب سے خوبصورت، سب سے خوش قسمت لڑکی ہوں، اس کے بھورے بال جن میں کہیں کہیں سنہرا پن جھلکتا ہے میرا دل چاہتا اپنی مٹھیوں میں سمیٹ لوں، اس کی بھوری آنکھوں کی چمک، میں تمہیں کیا بتاؤں جیسے.....'' کھنکتی آواز میں بولتی یہ وہ حرم تو نہیں تھی یہ تو کوئی اور ہی تھی۔

ڈریسنگ روم کے دروازے میں کھڑا رومان ساکت تھا، اسے پسند کی شرٹ نہیں مل رہی تھی، جو ملیں وہ پسند نہیں آئیں تھیں۔

''ہاں پھر بات کروں گی اوکے۔'' اس نے فون بند کر کے ایک طویل سانس لی اور مسکراتے ہوئے باہر نکل گئی، یہ جانے بغیر کہ وہ ابھی تک وہیں کھڑا تھا۔

☆☆☆

ناشتے کی میز پر بالکل خاموشی تھی۔

''آج مجھے اماں کی طرف جانا ہے، آپ پلیز جلدی آ جایئے گا۔'' اس نے جوس کا گلاس اس کے سامنے دھرا۔

''آپ چلی جایئے گا میں.....'' کے وہ کہنے لگا حرم نے اس کی بات قطع کر دی۔

''پلیز رومان! مجھے آپ کے ساتھ جانا ہے۔'' اس کے انداز میں دھونس تھی۔

''میں بزی ہوں آج۔'' اس نے صفائی سے دامن بچایا۔

''ہم کل چلے جائیں گے۔'' اس نے فوراً کہا، وہ کوئی جواب دیئے بنا جوس پینے لگا، حرم کچھ دیر انتظار کرتی رہی شاید وہ کچھ بولے۔

''آج شزا اور فہد بھائی آئیں گے لنچ پر، آپ کوشش کیجیے گا کہ لنچ گھر پہ کر سکیں۔'' اس نے آہستگی سے یاد دلایا۔

''آئی ول ٹرائے۔'' وہ کہتا ہوا کرسی دھکیل کر کھڑا ہو گیا۔

اس کے آفس جانے کے بعد وہ گھر کے کاموں میں مصروف ہو گئی، اس بڑے سے محل جیسے گھر میں اس کی مصروفیت کے لیے بے پناہ چیزیں تھی، بڑا سا ہرا بھرا لان یا پھر کچن، یہ دو اس کی پسندیدہ ترین جگہیں تھیں جن میں وہ اکثر پائی جاتی تھی، کبھی کبھی وہ بے طرح بوکھلا سی جاتی تھی، اسے اتنے بڑے گھر سے عجیب سی وحشت ہوتی تھی، اسے تو بس دو کمروں کے چھوٹے سے

برآمد والے گھر میں رہنے کی عادت تھی، مگر یہ تو قسمت نے اسے یہاں لا پھینکا تھا جس کا یقیناً کوئی حل نہیں تھا، وہ دل لگانے کی کوشش کرتی رہتی تھی جس میں بڑا ہاتھ لائبہ کا تھا وہ اتنی چھوٹی سی تھی کہ حرم کو ہر وقت خود میں الجھائے رکھتی تھی۔

اس وقت بھی وہ لائبہ کو گرم کپڑے پہنا رہی تھی مگر سوچ رومان میں الجھی ہوئی تھی۔

ایسا نہیں تھا کہ وہ اس کا شادی کے بعد ابتدائی دنوں والا رویہ بھول گئی، ایسا قطعاً نہیں تھا، مگر اب رومان کا رویہ اتنا بہتر تھا کہ وہ پچھلی باتیں بھولنے پر خود کو مجبور پاتی تھی، ہاں البتہ یہ بات اسے آج بھی کھٹکتی تھی کہ وہ اتنا سرد مزاج کیوں تھا، خاموش طبع، الگ تھلگ بلکہ اگر ایمانداری سے تجزیہ کیا جاتا تو تلخ مزاج کہنا زیادہ بہتر رہتا، جب دوپہر میں شزا کے آنے کا وقت تھا تو حرم نے دل کا پکا عہد باندھا ہوا تھا کہ وہ اس سے سارا کے بارے میں ضرور پوچھے گی، وہ جاننا چاہتی تھی کہ آیا رومان پہلے ہی ایسا تھا یا اب ہو گیا تھا۔

ہوتا ہے نا ایسا کوئی دکھ کوئی غم کوئی اذیت یوں دل میں گھر کرتی ہے کہ انسان اپنے آپ کو بھول جاتا ہے، یاد رہ جاتا ہے تو بس وہ شخص جو بچھڑ جاتا ہے۔

''کیا کھونے کا غم ہی رومان کے اندر بیٹھ گیا تھا؟'' اس کے ذہن میں ایک عجیب سا سوالیہ نشان تھا۔

مگر وہ صرف سوچتی رہ گئی، شزا نے فون پہ آنے سے معذرت کر لی تھی، اسے ایمرجنسی میں فہد کے ساتھ کسی دوست کی طرف جانا پڑ گیا تھا، ساری دوپہر حرم نے سیڑھیوں پہ بیٹھے گزار دی، شاید وہ پھر سے قنوطی ہو رہی تھی، زینت اسے بلانے آئی تو وہ بلا حجت کے اٹھ کر چل دی، اندر آ کر اس نے شام کے کھانے کی تیاری شروع کر دی، بھنڈی گوشت کے لیے ڈھیر ساری پیاز کاٹتے ہوئے وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ یہ پانی آنکھوں سے بہہ رہا تھا یا دل سے؟

مغرب ڈھل رہی تھی جب وہ کچن سے فراغت پا کر نکلی، چینج کرنے بعد اس نے بلیک لانگ شرٹ اور Copper گرم شال اوڑھی اور نماز کے لیے کھڑی ہو گئی۔

اس وقت وہ آخری دو نوافل ادا کر رہی تھی جب اسے گاڑی رکنے کی آواز آئی، اس کا دھیان یکدم نماز سے ہٹ گیا، اس نے دل ہی دل میں استغفار پڑھتے ہوئے رکوع کیا، قدموں کی آوازیں بتدریج قریب آ گئی تھیں، اس کا دل پنچھی کی مانند پھڑ پھڑانے لگا، پھر دروازہ کھل گیا، وہ قیام کر رہی تھی، پوری کوشش اور توجہ کے باوجود اسے اپنی توجہ مرکوز رکھنے میں خاصی دشواری

پیش آ رہی تھی، بڑھتے ہوئے قدموں کی آواز بیڈ کے قریب آ کر رک گئی، پھر وہ بیڈ پر بیٹھ گیا اور سوئی ہوئی لائبہ سے پیار کرنے لگا۔

حرم نے سلام پھیرا Copper شال نماز کے اسٹائل میں اوڑھے اس کا چہرہ بڑا ملیح اور پرنور سا لگ رہا تھا، رومان کو اپنے احساسات پر حیرت ہوئی، حالانکہ وہ کسی قسم کی آرائش سے مبرا تھا، وہ اب دعا کے لیے ہاتھ اٹھا چکی تھی، وہ پتا نہیں کیا پڑھ رہی تھی اس نے بے اختیار اللہ سے معافی مانگی اور پھر خود کو مجبور پاتے ہوئے ہاتھ چہرے پر پھیر کے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''السلام وعلیکم!'' اس نے جائے نماز تہہ کرتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔

''وعلیکم السلام!'' وہ بولا۔

حرم کے دل کی حالت قدرے سنبھلی، اس کا دل چاہا وہ کھلکھلا کر ہنستی ہوئی اس کے قریب جائے اور اس کا ہاتھ پکڑ کر زور زور سے گھومے، وہ اپنی خواہش دباتی جائے نماز رکھ کر پلٹی۔

''آپ چینج کر لیں میں کھانا لگاتی ہوں۔''

''نہیں، ابھی میرا موڈ نہیں ہے، چائے مل سکتی ہے؟'' وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

''جی میں لاتی ہوں۔'' اس نے اثبات سے سر ہلایا۔

وہ ایڑیوں پہ گھوما اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا، وہ چند لمحے وہیں کھڑی رہی پھر کچن کی طرف بڑھ گئی، چائے بناتے ہوئے اس نے اماں کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا جو اسے کتنے ہی دنوں سے اپنی طرف آنے کا کہہ رہی تھیں، جا تو وہ ڈرائیور کے ساتھ بھی سکتی تھی مگر کیا کیا جائے کہ اس بار اماں کا مطالبہ تھا کہ وہ رومان کو بھی ساتھ لے کر آئے، وہ شادی کے بعد ایک بار بھی ان کی طرف نہ آیا تھا۔

رومان سے دوبارہ بات کرنے کا سوال ہی نہیں تھا، وہ صبح بات کر کے رزلٹ دیکھ چکی تھی، وہ چائے لے کر گئی تو رومان شاور لے کر باہر آ چکا تھا، تولیے سے سر رگڑتے ہوئے اس نے دروازہ کھلنے پر ایک لمحے کو رک کر دیکھا اور پھر سے مگن ہو گیا، حرم نے بڑھ کر اس سے تولیہ پکڑ لیا، وہ بال بنانے لگا۔

''آپ تیار ہو جائیں، ہم آپ کی والدہ کے ہاں چل رہے ہیں۔'' اس نے کہا، وہ حیران سی رہ گئی، پھر ایک بے اختیار مسکراہٹ نے اس کے لبوں کو چھو لیا۔

''اچھا، میں بس تیار ہی ہوں۔'' وہ تولیہ لے کر باہر نکل گئی، وہ کرسی پہ بیٹھ کر چائے

پینے لگا، اسے مزہ آ گیا، چائے واقعی مزیدار تھی، حرم ہمیشہ چائے اور کافی بہت اچھی بناتی تھی جبکہ سارا بے حد بدذائقہ چائے بناتی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ واپس آ گئی، رومان نے دیکھا وہ اسی لباس میں تھی، البتہ داہنی کلائی میں دو کنگن پہنے تھے اور لبوں کا رنگ ہلکا گلابی چمکدار تھا، اس نے دونوں ہاتھوں میں لائبہ کو اٹھایا ہوا تھا جبھی اس کی نظر فوراً کنگنوں پر پڑ گئی تھی۔

''چلیں۔'' وہ ہلکے سے مسکرائی۔

رومان سر ہلاتا اٹھ گیا، دونوں آگے پیچھے چلتے پورچ میں آ گئے، رومان نے بڑھ کر اس کے لیے دروازہ کھولا، وہ لائبہ کو لے کر بیٹھ گئی، ہینڈ بیگ پیروں کے نزدیک رکھ لیا، رومان گھوم کر دوسری طرف آیا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا گاڑی گیٹ سے نکلی تو وہ اس سے مخاطب ہوا۔

''آپ مجھے راستہ سمجھائیں گی؟''

''جی۔'' وہ اسے بتانے لگی، اندر سے وہ بے حد خوش تھی، اسے امید نہیں تھی وہ اتنی جلدی مان جائے گا، بلکہ اس کے دل کی بات جان جائے گا، اماں کو اس نے فون کر دیا تھا رومان کے ساتھ باہر نکلتے ہوئے کتنی نگاہوں میں رشک سمٹ آیا تھا۔

اماں ان کے استقبال کے لیے مکمل طور پر تیار تھیں، وہ بے حد محبت اور پیار سے رومان سے ملیں، ان کی خوب آؤ بھگت کی، وہ بھی خوشی خوشی انہیں اپنے گھر کی باتیں بتاتی رہی، رومان باہر برآمدے میں آ بیٹھا تو وہ اندر اماں کے پاس آ گئی جو کچن میں مصروف تھیں۔

''اماں! یہ کچھ پیسے ہیں آپ رکھ لیں۔'' اس نے ہینڈ بیگ سے دو نیلے نوٹ نکال کر کہا، اماں ایک دم سے بدک گئیں۔

''حرم! کیا بات کرتی ہو تم، تمہارا دماغ درست ہے، میں تم سے پیسے لوں گی، کیوں بھلا؟'' وہ سخت خفا ہو گئیں۔

''اوہ ہو اماں میری بات کو سمجھیں کیا ہو گیا ہے آپ کو، میں اپنی خوشی سے دے رہی ہوں اور.....'' وہ جھنجھلا کر بولنے لگی، انہوں نے فوراً ٹوک دیا۔

''میری خوشی اس میں نہیں ہے تم فکر نہ کرو، دو دو کانوں کا کرایہ آ جاتا ہے کھانے والے ہیں ہی کتنے، گزارا بڑے آرام سے ہو جاتا ہے، کرم ہے مالک کا۔'' انہوں نے سبھاؤ سے انکار کیا۔

''اماں پلیز! میں کہہ رہی ہوں ناں؟'' وہ ضد کرنے لگی۔

''تمہارے میاں کو پتا ہے؟'' انہوں نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔

''نہیں اور فکر مت کریں، ان کے نزدیک اتنے سے پیسوں کی کیا اہمیت؟'' حرم نے لاپرواہی سے کہا۔

''یہی غلطی کر رہی ہو تم، بات اتنے سے پیسوں کی نہیں، خواہ تم کہیں دو روپے بھی خرچ کرو، تمہارے میاں کے علم میں ہونا چاہئے کیوں خوامخواہ غلط فہمی پیدا کرنے کا موقع دے رہی ہو تم؟'' اس بار اماں بھی غصے میں آ گئیں۔

''اماں! آپ بھی ناں؟ ادھر دیکھیں، دیکھیں اس پرس کے اندر کتنے ڈھیر ہیں نوٹوں کے، میں نے کیا کرنا ہے ان کا؟ آپ کا حق ہے، میری بات غلط تو.....'' وہ کہنے لگی، اماں نے سختی سے اس کی بات کاٹ دی۔

''بس کر دو حرم، حد ہو گئی، کیوں لوں میں تم سے پیسے، مائیں بیٹیوں کو دیتی ہیں لیتی نہیں اب چلو میں کھانا لگانے لگی ہوں۔'' انہوں نے حتمی لہجے میں بات سمیٹی۔

حرم جھنجھلا کر واپس پلٹ گئی، واپسی کے سفر میں حرم قدرے خاموش تھی اور اسی خاموشی میں اس نے رومان کے سرد اور تنے ہوئے چہرے کو غور سے نہیں دیکھا، وہ بہت ریش ڈرائیونگ کر رہا تھا، حرم نے اپنی دھن میں اتنا نوٹ نہیں کیا تھا اور یہی اس کی غلطی تھی۔

گھر پہنچ کر وہ سیدھا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا، تب حرم نے نوٹ کیا کہ وہ قدرے ڈسٹرب تھا، اس نے حرم سے کوئی بات نہیں کی، نہ ہی اس سے حرم کے گھر کے متعلق کوئی کمنٹ دیا تھا، وہ شاید اس کے پیچھے جانا چاہتی تھی مگر لائبہ رونے لگ گئی، اسے بہلاتے بہلاتے کافی دیر گزر گئی، حرم سارے دن کی تھکی ہوئی تھی اب کی بار اس نے تھکن کو پس پشت ڈالا اور لائبہ کو لٹا کر چینج کیے بنا ہی رومان کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

وہ حسب معمول سلائیڈنگ ونڈو کھولے فون پہ کسی کے ساتھ محفو گفتگو تھا، حرم نے آگے بڑھ کر اس کی پشت سے سر ٹکاتے ہوئے دونوں بازو اس کے گرد لپیٹ دیئے، وہ فوراً چونکا۔

''موڈ کیوں اپ سیٹ ہے جناب؟'' وہ دھیمے لہجے میں بولی، وہ فون بند کرتے ہوئے جھٹکے سے پلٹا، یوں کہ وہ اس کے سامنے آ گئی۔

''کیا بات ہے رومان؟'' وہ اس کے تنے ہوئے چہرے کو دیکھ کر ڈر گئی، وہ سرخ

آنکھوں سے اسے گھورتا رہا۔

''خیریت تو ہے ناں؟ کس سے بات کر رہے تھے آپ؟'' وہ قدرے سہم سی گئی تھی۔

''حسان ٹھیک کہتا تھا، یہ مڈل کلاس لڑکیاں مرتی ہیں دولت کے پیچھے، امیروں پہ ان کی رال بڑی جلدی ٹپک جاتی ہے۔'' اس کا لہجہ بڑا زہریلا تھا حرم زرد پڑ گئی۔

''کیا مطلب؟ یہ کسی باتیں کر رہے ہی آپ؟'' وہ الجھ گئی۔

''زیادہ معصوم بننے کی کوشش مت کرو حرم آصف۔'' رومان کے سرد لہجے میں نفرت تھی، حرم اس کے طرز تخاطب پہ ساکت سی اسے دیکھتی رہی۔

''وہ صحیح کہتا تھا، میں تو ہینڈسم پلس رچ ہوں، مجھے دیکھ کر تو تمہارے ''حواس'' پہلے دن ہی جواب دے گئے تھے، مجھے اب تک وہ تمہارا Still and silent سٹائل یاد ہے، جب تم نے مجھے پہلی بار دیکھا تا۔'' وہ شعلے اگل رہا تھا۔

''یہ فضول الزام تراشیاں بند کیجیے، جو بھی بات ہے صاف صاف کیجیے رومان صاحب!'' وہ چیخ گئی تھی۔

''صاف بات تو یہ ہے یہ اچھائی کا ڈھونگ رچانا اب بند کر دو۔'' وہ نفرت سے بولا۔

''کیا آپ مجھے سچ بات بتائیں گے؟'' وہ یکدم ضبط کھو کے بلند آواز میں چلا اٹھی تھی، رومان کا ہاتھ بے ساختہ اٹھا اور پوری قوت سے حرم کے دائیں گال پر نشان ڈال گیا۔

''اپنی آواز دھیمی رکھو، مجھے بلند آواز میں بات کرنے والی عورتیں بالکل پسند نہیں ہیں۔'' وہ غرایا تھا، حرم کی آنکھیں چھلک اٹھیں۔

''آپ حق رکھتے ہیں رومان صاحب! کیوں کہ میں آپ کو اپنی سچائی جو بتا چکی ہوں، اس لیے آپ مجھے جیسے چاہیں ذلیل کریں۔'' وہ اپنے آنسوؤں پر قابو پا کر کرب آمیز لہجے میں بول رہی تھی، وہ استہزائیہ ہنس دیا۔

''سچ، یہ لفظ بہت عجیب لگتا ہے تمہارے منہ سے کون سا سچ؟ میں تمہیں سچ بتاتا ہوں، سچ تو یہ ہے کہ تم بے ایمان ہو میری دولت پر میری دولت نے تمہیں اندھا کر دیا، بہت پلاننگ سے تم نے پہلے یوں شو کیا کہ جیسے تمہیں میری دولت سے مجھ سے کوئی دلچسپی نہیں، پھر جب تم نے دیکھا کہ تم مجھے امپریس کرنے میں کامیاب ہو چکی ہو تو پھر تم نے بہت ذہانت سے مجھے اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا..... اور..... اور سب سے بڑھ کر تم نے مجھے دھوکہ دیا، مجھے بے وقوف بناتی

رہیں اپنی سادگی سے، اپنی معصومیت سے؟'' وہ دھاڑ رہا تھا، حرم کو اس کے لبوں سے نکلتے شعلے جھلسائے دے رہے تھے۔

''آخر میں نے ایسا کیا کیا ہے؟'' وہ بے جان ہو کر پوچھ رہی تھی۔

''تمہیں کیا لگتا ہے میں انجان ہوں؟ مجھے اپنی کشش کا اپنی پرسنالٹی کا اندازہ نہیں؟ سب پتا ہے مجھے لیکن میں نے کبھی کیش کروانے کی کوشش نہیں کی اور تم کیا سمجھتی ہو، میں بے خبر ہوں قطعاً نہیں، مجھے سب خبر ہے، مجھے پتا ہے مجھے کون سے دھوکے دیئے جا رہی ہو، کیوں گئیں تھیں اپنی اماں کی طرف، روپے دینے؟'' وہ اپنی ساری تپش اس پر انڈیل چکا تھا، حرم نے کپکپاتے لبوں سے اسے دیکھا تو بلی تھیلے سے باہر آ گئی۔

''کاش! میں آپ کو وضاحت دے سکتی۔'' وہ بھیگے ہوئے چہرے اور ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولی تھی، وہ نفرت سے اسے دیکھتا رہا۔

''مجھے وضاحتوں سے نفرت ہے حرم آصف! اور تم جیسے دو غلے لوگوں سے وضاحت سننا میری توہین ہے۔'' وہ بدستور اسی طرح اکھڑے ہوئے لہجے میں بول رہا تھا۔

ایک ایک کر کے حرم کے سارے آنسو گرتے چلے گئے، وہ پلٹی اور تھکی ہوئی شکست خوردہ چال چلتی ہوئی باہر نکل گئی۔

☆☆☆

اگلی صبح بڑی عجیب دھند بھری تھی، لائبہ کو بخار ہو رہا تھا اور حرم اس سے یکسر بے پرواہ نظر آتی تھی۔

جب آنے لگتا ہے اس کی رفاقت میں سکون محسن
پھر یوں ہوتا ہے کہ وہ شخص بدل جاتا ہے!

وہ گہری خاموشی کے حصار میں تھی اور اس بھید بھری خاموشی میں کیا تھا، بتانا مشکل تھا، ناشتے کی میز پر زینت بی بی نے رومان کو لائبہ کی بیماری سے مطلع کیا، وہ فوراً پریشان ہوا تھا، ناشتہ کیے بغیر ہی وہ اٹھا اور اس کے کمرے کی طرف چل دیا، بیڈ پر لائبہ لیٹی زور زور سے رو رہی اور حرم ندارد!

''حرم!..... حرم!'' اس نے فوراً لائبہ کو اٹھاتے ہوئے حرم کو پکارا۔

واش روم سے حرم باہر آئی تو اس کی آنکھیں سوجی ہوئی متورم تھیں اور چہرہ بھیگا ہوا۔

''کیا آپ کو اپنی ذمہ داری کا احساس ہے؟ کم از کم آپ کو اب اپنی حیثیت کے مطابق ادھر ایڈجسٹ منٹ کر لینی چاہیے محترمہ!'' وہ چیختے ہوئے لہجے میں بولا تھا۔

''کیا ساری زندگی ایڈجسٹمنٹ میں گزار دوں؟'' وہ سراپا سوال بن گئی، رومان نے قدرے چونک کر اسے دیکھا۔

''اگر آپ سمجھوتہ کرتے کرتے تھک چکی ہے حرم، بہتر ہوگا کہ اپنا سامان پیک کیجیے اور اپنی والدہ کے گھر تشریف لے جائیں۔'' اس کا برف لہجہ حرم کو آگ میں دھکیل گیا، اس نے بے یقینی سے اسے باہر نکلتے دیکھا اور بغیر کچھ کہے اس کے پیچھے باہر نکل گئی۔

پورچ میں آ کر اس نے ڈرائیور سے گاڑی نکالنے کا کہا اور بیٹھتے ہی گھر چلنے کا کہہ دیا، سارا رستہ اس کی آنکھوں نے بے آواز آنسو بہائے تھے۔

اپنے ماضی کے تصورات سے ہراساں ہوں میں
اپنے گزرے ہوئے ایام سے نفرت ہے مجھے
اپنی بے کار تمناؤں پہ شرمندہ ہوں میں
اپنی بے سود امیدوں پہ ندامت ہے مجھے
میری امیدوں کا حاصل میری کاوش کا صلہ
ایک بے نام اذیت کے سوا کچھ بھی نہیں

اماں اسے یوں آتے دیکھ کر حیران وہ گئیں تھیں، وہ سیدھی جا کر کمرے میں بستر پر گر گئی۔

''اماں پلیز میں..... میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتی ہوں، سب ٹھیک ہے اور مجھے کچھ نہیں ہوا'' اس نے مختصراً سا بیان جاری کیا جس سے اماں کی قطعاً تسلی نہ ہوئی، مگر وہ لحاف اوپر کھینچ چکی تھی وہ خاموشی سے باہر چلی گئیں۔

کمرے کی وحشت ناک خاموشی میں اس کا دل کرلا رہا تھا، گھٹ گھٹ کر روتے ہوئے اسے رومان کی باتیں یاد آ رہی تھیں اور اذیت حد سے سوا ہوتی جا رہی تھی۔

اس کا سر بہت بھاری ہو رہا تھا، آنکھوں سے نکلتے آنسوؤں پر تو اختیار تھا ہی کب؟ مگر اس گھڑی سر تکیے پر پٹختے ہوئے اس نے بڑی شدت سے خواہش کی کہ اسے نیند آ جائے، پتا نہیں مقبولیت کی گھڑی تھی یا وہ واقعی ذہنی طور پر ختم ہو چکی تھی کہ اسے نیند آ گئی۔

سونے کے باوجود اس کی نیند بھی بڑی بے چین تھی، کوئی بے تاب سسکی، کوئی کرلاتی

ہوئی کراہ بہت بے اختیار سی نکل جاتی لبوں سے، جب دوبارہ اس کی آنکھ کھلی تو کمرے میں ملگجا سا اندھیرا تھا، باہر دھوپ چمک رہی تھی مگر کمرے کا دروازہ بند ہونے کی وجہ سے اندر روشنی کم تھی، وہ ویسے ہی پڑی رہی، اس کے سر کا درد ختم ہو چکا تھا اور وہ حیرت انگیز طور پر خود کو بہت پرسکون محسوس کر رہی تھی، کچھ دیر مزید وہ آلکسی سے پڑی رہی پھر لحاف ہٹاتی اٹھ گئی۔

باہر آ کر اس نے دیکھا اماں دھوپ میں بچھے تخت پر بیٹھی چاول چن رہی تھی وہ آہستگی سے چلتی باتھ روم کی طرف بڑھ گئی، منہ دھوتے ہوئے اس نے باہر کسی گاڑی کے رکنے کی آواز سنی، اس کا دل پوری قوت سے سکڑ کر پھیلا تھا وہ تیزی سے دروازہ کھولتی باہر آ گئی۔

بیرونی دروازے سے شزا اندر داخل ہو رہی تھی، وہ تیزی سے اندر کمرے کی طرف مڑ گئی، شزا نے اسے دیکھ لیا تھا مگر اماں سے ملنے کے لیے رک گئی، اماں سے مل کر شزا اندر آ گئی، حرم بستر پر بیٹھی ہوئی تھی، شزا اس کے پاس آ گئی۔

''مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی حرم۔'' اس کا لہجہ افسوس بھرا تھا۔

''اور مجھے آپ کے بھائی سے۔'' حرم نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

''کیا بے وقوفی کر بیٹھی ہو؟ کوئی اپنا گھر چھوڑتا ہے بھلا؟'' شزا بے چین سی ہو کر پوچھ رہی تھی۔

''بے وقوفی.....؟'' وہ آہستگی سے ہنس پڑی، بڑی طنزیہ ہنسی۔

''ہاں بے وقوفی، میں تو ہمیشہ سے ہی بے وقوف ہوں، ارم صحیح کہتی ہے مجھے انسانوں کی پرکھ نہیں ہے، ہو ہی نہیں سکتی میں سمجھ ہی نہیں پائی کہ آپ کے بھائی کے اندر کس قدر زہر بھرا ہوا ہے؟ مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ وہ کتنے تنگ دل اور شکی ذہن کے مالک ہیں؟ مجھے علم ہی نہیں ہو سکا کہ وہ کس قدر سرد مزاج ہیں؟ میں..... میں بے وقوف ہوں، ہاں مجھے اعتراف ہے، میں ہوں بے وقوف، اسی لیے تو انہیں چاہتی رہی، ان سے پیار کرتی رہی، ان سے محبت کرنے لگی تھی میں، ہوں ناں احمق؟'' وہ کہتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

شزا نے بے اختیار اس کے شانے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے ساتھ لگا لیا۔

''مجھے بتاؤ تو سہی حرم! ہوا کیا ہے؟'' اس نے حرم کی پشت سہلائی۔

''اپنے بھائی سے ہی پوچھ لیتیں ناں آپ۔'' وہ سسکیوں کے بیچ بولی۔

''اگر انہوں نے کچھ بتایا ہوتا تو تم سے کیوں پوچھتی؟'' وہ عاجز آ گئی۔

''تو پھر آپ کو کیسے پتا چلا کہ میں ادھر ہوں؟'' حرم نے الگ ہو کر استعجاب سے پوچھا۔

''زینت کا فون آیا تھا، لائبہ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، میں نے پوچھا تم کہاں ہو؟ کہنے لگی بی بی تو اپنے گھر گئی ہیں۔'' شزا نے تفصیلاً بتایا، حرم خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔

''اب تم مجھے بتاؤ بات کیا ہے؟''

''میں آپ کو کیا بتاؤں.....؟ انہوں نے مجھے کس طرح ذلیل کیا ہے؟ مجھے ہمیشہ یہ سمجھ نہیں آتی تھی کہ وہ اتنے سرد مزاج کیوں ہیں، میں نے سوچا تھا کہ میں آپ سے پوچھوں کہ آخر ایسی کون سی وجہ تھی جس سے وہ ایسے ہو گئے، مگر انہوں نے اس کا موقع ہی نہیں آنے دیا انہوں نے مجھے.....'' وہ رک رک کر روتے ہوئے شزا کو سب بتاتی چلی گئی اول سے آخر تک۔

جب وہ خاموش ہوئی تو شزا کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔

''میرا بھائی ایسا نہیں تھا حرم وہ بالکل ایسا نہیں تھا۔'' کہتے ہوئے شزا کا لہجہ بھیگا ہوا تھا۔

''وہ ایسے ہی ہیں شزا!'' حرم تلخی سے بولی۔

''نہیں حرم! میرا بھائی تو بہت اچھا تھا، بڑا رحم دل اور خوش مزاج، اسے تو سارا نے ایسا بنا دیا'' اس نے انکشاف کیا۔

''سارا نے.....؟'' حرم ششدر رہ گئی۔

''ہاں، سارا نے، تمہیں پتا ہے میرے بھائی سے اس کی لو میرج تھی، مگر وہ بے انتہا شکی مزاج کی عورت تھی، شادی سے پہلے اس کو بھائی نے پوزیسو نہیں سمجھا مگر یہ سے شادی کے بعد یہ بھید کھلا ہے کہ یہ پوزیسو نہیں درحقیقت اس کی Suspiceous nature تھی، اسے بھائی کی ہر بات پر اعتراض تھا، ان کے ہنسنے پر، ملنے جلنے پر اور گھومنے پھرنے پر بھی، تمہیں پتا ہے اس نے کیا کیا؟ اس نے بھائی کے آفس سے سارا فی میل سٹاف نکال دیا تھا، وہ بھائی کے ساتھ پارٹیز پر نہیں جاتی تھی، اسے ہمیشہ یہ شک رہتا تھا کہ بھائی کا کہیں نہ کہیں کوئی افیئر چل رہا ہے، وہ دیر سے گھر آتے تو سارا ایک ہنگامہ کھڑا کر دیتی تھی، وہ درحقیقت خود پسندی کی انتہا پر پہنچی ہوئی ایک نفسیاتی مریضہ تھی، جیسے ایکسٹرا آرڈنری توجہ چاہیے ہوتی تھی اور جسے میرے بھائی کی ہر بات پر اعتراض تھا۔''

''بھائی کو بچوں کا شوق تھا اور اسے بچے پسند نہیں تھے، سوچو ذرا ہو سکتی ہے کوئی ایسی

عورت مگر وہ تھی، لائبہ اگر اس دنیا میں آ گئی ناں تو اس کے پیچھے بھی میرے بھائی کی ضد کا ہاتھ تھا، اس نے میرے بھائی کو بھی اپنے جیسا کر دیا تھا سرد مزاج، شکی اور زہریلا، بھائی سب سے الگ تھلگ ہو گئے، اتنے سرد مزاج ہو گئے کہ مجھے یقین نہیں ہوتا تھا، وہ لائبہ کی پیدائش سے پہلے ہی بھائی سے کہتی تھی کہ ''دیکھنا رومان! تمہاری ضد مجھے مار ڈالے گی۔'' مگر حرم! بھائی بھی آخر کب تک انتظار کرتے وہ اس سوشل بائیکاٹ سے تنگ آ چکے تھے، انہیں بھی خواہش تھی کہ وہ اولاد کی نعمت سے سرفراز ہوں، مگر ہوا اس کے برعکس، سارا کی وفات پر بھائی حد درجہ ڈسٹرب تھے، وہ سراسر خود کو قصوروار سمجھتے تھے، مگر ایسا کب تک چلتا، لائبہ بہت چھوٹی تھی اور میں اپنا گھر بار چھوڑ کر ادھر آ کر نہیں بیٹھ سکتی تھی اس لیے میں نے پورا زور لگا کر ان سے شادی کے لیے ہاں کروالی۔''

''مگر اس سارے قصے میں میرا کیا قصور ہے؟'' وہ جھلا گئی۔

''نہیں میری جان، قصور تمہارا نہیں، یہ سب تمہیں بتانے کا مقصد صرف یہ ہے کہ تم اس لیے نشانہ بنی کیونکہ یہ سب غلط خیالات بھائی کے دماغ میں حسان نے بھرے ہیں۔'' شزا نے بتایا۔

''مگر کیوں؟'' وہ مزید حیران ہوئی۔

''کیا کہہ سکتے ہیں، پتا نہیں اس کے مڈل کلاس کے متعلق ایسے ویوز کیوں ہیں؟ ٹھیک ہے رائے ہر شخص کی آزاد ہوتی ہے مگر اس کا مطلب یہ قطعاً نہیں کہ آپ دوسروں پر اپنے نظریات ٹھونسنا شروع کر دیں۔'' شزا قدرے خفا لہجے میں کہہ رہی تھی۔

''آیم سوری شزا! میں آپ کے خیالات سے متفق نہیں ہوں کیا رومان اتنے ہی معصوم ہیں کہ اتنے سکون سے کسی کی رائے پر یقین کر لیں؟'' حرم نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''میں کیا کہہ سکتی ہوں حرم مگر یقین کرو کہ میرے بھائی جیسے بھی ہیں مگر خود پسند قطعاً نہیں ہیں، یہ زہر یقیناً اس کے دماغ میں انجیکٹ کیا گیا ہے'' شزا نے صفائی دی تھی، حرم اتفاق کرنے والے انداز میں انہیں دیکھتی رہی۔

''اب آپ کیا چاہتی ہیں؟'' اس نے طویل سانس کھینچ کر پوچھا۔

''میں چاہتی ہوں تم گھر واپس چلو۔'' شزا نے حتمی لہجے میں کہا۔

''یہ ناممکن ہے۔'' حرم نے تیز لہجے میں کہا۔

''بے وقوفی کی باتیں مت کرو تم ان سے دور رہ کر اپنی اہمیت کم کر لو گی۔'' شزا نے

اسے ڈرایا۔

''میری اہمیت کیا ہے؟ مجھے اچھی طرح اندازہ ہے۔'' وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔

''اس طرح نہ کرو حرم اس طرح تو غلط فہمیاں مزید بڑھ جائیں گی۔'' شزا تھکے ہوئے لہجے میں بولی تھی۔

''فکر نہ کریں آپ، پہلے کون سی انڈر اسٹینڈنگ ہے۔'' وہ بدستور اسی لہجے میں بول رہی تھی۔

''تو پھر کیا چاہتی ہو تم؟'' شزا کے ماتھے پر شکن آ گئی۔

''انہوں نے خود مجھے گھر سے جانے کا کہا تھا، اب وہ خود مجھے لینے آئیں گے تو ہی میں جاؤں گی۔'' وہ ہٹ دھرمی سے بولی، شزا نے طویل سانس لے کر اس کا شانہ تھپتھپایا اور اٹھ گئی۔

''کرتی ہوں بھائی سے بات، اپنا خیال رکھنا اور پلیز اس سارے معاملے پر دوبارہ غور کرنا شاید تمہارا فیصلہ بدل جائے۔'' شزا لجاجت سے کہتی باہر نکل گئی۔

☆☆☆

وہ بے حد ٹینس تھا، رات حرم سے ہونے والی تلخ کلامی اور پھر صبح اس کا یوں چلے جانا اسے از حد الجھا گیا تھا، اسے خود سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اب وہ کیا کرے جب کیا دھرا بھی سب اپنا تھا، دوپہر میں پہلے زینت کا فون آیا تو پتا چلا کہ لائبہ کی طبیعت مزید بگڑ چکی تھی، وہ حرم کو بے حد مس کر رہی تھی، رومان نے شزا کو فون کیا تو وہ الٹا تفتیش کرنے لگ گئی، وہ جھلا کر فون بند کر کے آفس سے نکل آیا، حسان آج چھٹی پر تھا، اس نے سوچا کہ وہ اس کے پاس ہی چلا جائے۔

اس وقت وہ حسان کے گھر کے گیٹ کے سامنے کھڑا تھا، چوکیدار اسے پہچانتا تھا تبھی کچھ مزید بولے بغیر گیٹ وا کر دیا، اس نے گاڑی پارک کی اور بے دھڑک حسان کے بیڈ روم کی طرف بڑھ گیا۔

حسان کے والدین پچھلے ہفتے سے امریکہ تھے اور اس وقت صرف وہ اور اس کی اکلوتی بہن انعم گھر تھے، جیسے ہی وہ بیڈ روم کے دروازے پر پہنچا، اندر سے اٹھتی تیز آوازوں نے اس کے قدم روک دیئے۔

''تم ہمیشہ کی طرح اس بار بھی ناکام ہو گئے حسان۔'' یہ انعم کی آواز تھی، غصے سے

بھری ہوئی۔

''انعم! میری بات.....'' حسان نے کچھ کہنا چاہا، انعم نے اس کی بات کاٹ دی۔

''تم پچھلے سات سالوں میں میری ایک خواہش پوری نہیں کر سکے حسان؟'' وہ شاید رونے لگی تھی، رومان الجھ گیا۔

''مجھ پر الزام تراشیاں بند کر دو انعم! کس قدر احسان فراموش ہو تم، کیا تمہیں احساس ہے کہ تمہارے لیے میں نے کیا کچھ کیا ہے، کس قدر گر گیا ہوں اپنی سطح سے۔'' حسان بلند آواز میں چلا رہا تھا۔

''کونسا احسان جتانا چاہ رہے ہو تم اور کون سی سطح سے گرنے کا رونا رو رہے ہو تم؟'' وہ بھی جیسے دوبدو مقابلے پر اتر آئی تھی۔

''بکواس بند کرو، صرف تمہاری وجہ سے میں سارا کو بہکاتا رہا کہ وہ رومان پر نظر رکھا کرے، رومان کو فلرٹ کرنے کی عادت ہے، صرف تمہاری وجہ سے..... تاکہ وہ سارا کی ضدی اور شکی فطرت سے تنگ آ کر اسے چھوڑ دے مگر بے سود..... پھر میں نے رومان کو اکسایا کہ بچہ پیدا کرے تاکہ یہ وجہ ہی ''وجہ تنازع'' بن جائے مگر وہ پیار کا رونا روتا رہا اسے صرف سارا کی خوشی عزیز تھی مگر کب تک، میں اسے یقین دلانے میں کامیاب ہو گیا کہ اولاد کے بغیر تمہاری کیا شناخت رہ جائے گی اور وہ معصوم دوستی کا مارا انسان میرے جال میں آ گیا، مگر ہوا کیا، سارا مر گئی مگر اس کی جگہ تمہیں نہیں مل سکی، وہ ویکنسی حرم نے فل کر دی، میرا خیال تھا کہ کچھ عرصے بعد جب وہ سنبھل جائے گا تو اس سے تمہارے ساتھ شادی کرنے پر راضی کروں گا مگر ہوا کیا پہلے ہی شزا نے حرم سے اس کی بات کر دی تب بھی میں نے کوشش تو کی تھی میں نے رومان کو ورغلانے کی کہ یہ لوئر مڈل کلاس لڑکیاں ایسی ویسی ہوتی ہیں وغیرہ وغیرہ مگر کب تک..... اس کا گھر برباد کرتا رہوں، صرف تمہاری وجہ سے اتنے سالوں سے اسے دھوکہ دے رہا ہوں اپنے جگری دوست کو، جو مجھ پر اندھا اعتماد کرتا ہے مگر اب کیا چاہتی ہو تم، حرم کی جگہ میں تمہیں نہیں دلوا سکتا! مان لو..... مان لو کہ ''رومان لاشاری'' تمہاری قسمت میں نہیں ہے۔'' وہ زور زور سے بولتا آخر میں تھکے لہجے میں التجا پر اتر آیا تھا۔

اس کے بعد کیا ہوا رومان کو یاد نہیں اسے صرف یہ یاد تھا کہ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے گاڑی تک آیا تھا اور اس نے گاڑی فل سپیڈ پر چھوڑ دی، اس کی آنکھوں میں دھواں اتر رہا تھا اور

اندر تک پھیلی ویرانی اور تاریکی اس کے وجود کو کسی خلا میں بھٹکائے جا رہی تھی۔

یوں تو غلط نہیں چہروں کا تاثر بھی مگر
لوگ ویسے بھی نہیں ہیں جیسے نظر آتے ہیں!

☆☆☆

جنوری کی ایک یخ بستہ رات تھی، دھند کے مرغولے آسمان سے برس رہے تھے اور اس کڑکڑاتی سردی میں وہ صحن میں لگے اکلوتے جھولے پر بیٹھی جھول رہی تھی ایسی ہی دھن اس کے دل کے گرد بھی ڈھیرا جما رہی تھی، انتظار اب تک انتظار ہی تھا اور پتا نہیں کب تک انتظار ہی رہنا تھا، وہ جیسے اندر سے ریزہ ریزہ ہو چکی تھی مگر اسے رومان لاشاری کو ہر حال میں یہ بتانا تھا کہ امیر ہو یا غریب جب بات عزت نفس پر آجائے تو سمجھوتہ ناممکن ہو جاتا ہے۔

اس نے ایک طویل سانس ہوا کے سپرد کی، ڈھیر ساری دھند ہوا میں بکھر گئی تھی۔

''کیا میرا انتظار، انتظار ہی رہے گا؟'' اس نے ڈوبتے دل اور سہمی دھڑکنوں کے ساتھ سوچا۔

جواب ایک عمیق خاموشی کے سوا کچھ نہ تھا، اس نے زور سے آنکھیں میچ لیں، یکلخت اس کے گرد ایک مخصوص خوشبو پھیل گئی، Old spiece کی مخصوص خوشبو، اس نے فوراً آنکھیں کھول دیں اور ایک لمبی سانس کھینچ کر اس مہک کو محسوس کیا، یہ قطعاً الوژن نہیں تھا، یہ حقیقت تھی۔

پھر ایک ہاتھ اس کے جھولے کی دائیں رسی پر آیا اور جھولے کی حرکت یکدم رک گئی تھی، حرم ساکت رہ گئی۔

''گھر چلو حرم۔'' رومان کا لہجہ بہت مدھم تھا، حرم کا دل رک سا گیا۔

''مجھے تمہاری ضرورت ہے حرم؟'' اس کے لہجے میں تھکن رچی ہوئی تھی۔

''ضرورت؟'' حرم کے دل میں تیر پیوست ہو گیا۔

''ہاں محبت ہی تو انسان کی ضرورت ہے حرم۔'' وہ کھوئے ہوئے انداز میں بولا تھا، وہ آہستگی سے جھولے سے اٹھ گئی، صحن کے سناٹے میں جھولے کی چوں چراں بہت زوردار تھی۔

''ہماری خامیاں، ہماری ناآسودگیاں ہماری روح میں چھوٹے چھوٹے سوراخ کر دیتی ہیں اور ہم ساری زندگی ان سوراخوں کو چھپانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں، جیسے میں، میں جانتی ہوں میں خوبصورت نہیں ہوں، آپ کے معیار پر پوری نہیں اترتی اور اس کمی کو میں نے

اپنی Humbleness میں چھپانے کی کوشش کی لیکن آپ، آپ میں تو یقیناً کوئی کمی نہیں ہے رومان، پھر بھی آپ نے ایسی سوچ کا مظاہرہ کیا، پھر بھی.....؟'' وہ تھکے لہجے میں کہتی بلک اٹھی۔

''تم ٹھیک کہتی ہو حرم، کمیاں اور خامیاں تو ہر انسان کی زندگی میں ہوتی ہیں، میں تو بالکل بھی مکمل نہیں ہوں، اس غلط فہمی سے نکل آؤ حرم، چہروں کی خوبصورتی پہ مت جاؤ یہ چہرے بہت دغاباز ہوتے ہیں، میں تو بہت ادھورا ہوں تم مجھے ''مکمل کر دو۔'' ایک مدھم سرگوشی فضا میں گونجی تھی اور سارا ماحول اس کے جادو کے زیر اثر آ گیا۔

اس نے اندھیرے میں مدھم سے نظر آتے رومان کے سائے کو دیکھا جو بتدریج اس کے قریب آ گیا تھا، اس کے شانوں پر رومان کے بھاری ہاتھوں کا بوجھ آ پڑا۔

''مکمل کر دو۔'' سرگوشی ایک بار پھر گونجی تھی۔

حرم نے آنکھیں بند کر کے سر اس کے سینے پر رکھ دیا، رومان نے اسے مضبوطی سے بھینچا اور اسے دائیں بازو کے حصار میں لے کر بیرونی دروازے کی طرف چل پڑا۔

فضا میں دھند بتدریج بڑھتی جا رہی تھی اور دو محبت کے مسافر اک دوجے کی ہمراہی میں محو سفر تھے۔

ہم کو لوگوں سے ملنے کا کب شوق تھا
محفل آرائی کا کب ہمیں ذوق تھا

حرم کی گنگناہٹ گاڑی میں پھیل رہی تھی، رومان کے لبوں پر دلکش مسکراہٹ آ گئی، اس نے حرم کا بھرپور ساتھ دیا

عشق بے در کرے عشق بے گھر کرے
عشق کا سچ ہے کوئی ٹھکانہ نہیں
ہم جو کل بے ٹھکانے کے تھے آدمی!
آپ سے مل کر کیسے ٹھکانے لگے

دونوں کی کھلکھلاہٹ سے گاڑی کی فضا مہک اٹھی تھی۔

حریف دوست

ہماری زندگی میں جو لوگ ہمارا غرور توڑتے ہیں وہ ہمارے ''حریف'' ہوتے ہیں۔

وہ میری ''حریف'' تھی

میری حریف ''ربیعہ مظہر''۔

لندن اسکول آف اکنامکس میں ایک لڑکی تھی، میرے مقابلے کی۔ صرف ایک..... ربیعہ مظہر..... مجھے جتنی نفرت اس لڑکی سے تھی۔ شاید کسی اور سے نہیں تھی، ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ میں اس قسم کا بندہ ہی نہیں ہوں جو خواہ مخواہ دوسروں کے لیے دل میں نفرت پالتا پھرے۔ لیکن اگر کوئی آپ کی راج دھانی میں نقب لگائے۔ آپ کا غرور توڑ دے، آپ کو ہرا دے۔ کیا آپ اس سے ''محبت'' کر سکتے ہیں۔ نہیں تو پھر میں کیسے اپنے دل کو سمجھالوں۔ میں سلجوق ہوں، سلجوق لغاری۔ لندن اسکول اف اکنامکس کا سب سے جینئس اور بریلئنٹ اسٹوڈنٹ، اساتذہ کا چہیتا اور ماں باپ کا لاڈلا، جسے صرف جیتنے کی عادت تھی۔ مگر ربیعہ مظہر نے آ کر مجھے احساس دلایا کہ عادتیں بدلنا بھی پڑتی ہیں۔ اس کی آمد کے بعد مجھے یکے بعد دیگرے جب شکست کی زحمت اٹھانی پڑی تو میں نے مانا کہ ہر سیر کا سوا سیر ہوتا ہے۔

جب وہ ہمارے بیچ میں آئی تھی تو کسی نے اسے کچھ خاص اہمیت نہیں دی تھی کیونکہ شاید اس میں کچھ خاص تھا ہی نہیں۔ مجھے وہ باقی لڑکیوں جیسی ہی لگی۔ ڈھیلے سے ٹراؤزر اور لوز شرٹ پہنے گلے میں اسکارف ڈالے اور بالوں کو پونی ٹیل کی صورت میں جکڑے ہلکی سی گندمی رنگت کے ساتھ مجھے وہ ہمیشہ عام سی لگی۔

پہلا دھچکا مجھے تب لگا جب فرسٹ سمسٹر کا رزلٹ اناؤنس ہوا اور میرا ریکارڈ بریک کرتے ہوئے وہ ٹاپ پر آ گئی۔ میں حیران تھا، بے حد حیران۔ تب میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ میری ہر ٹاپ پر وہ نظر آئے گی۔ میں نے اپنی حیرانی چھپالی اور رسمی طور پر ہی سہی اسے مبارک باد دی تھی اور یہی ہونے لگا۔ اس نے رفتہ رفتہ مجھے میری ہر پوزیشن۔ ہر گریڈ سے کک آؤٹ کرنا شروع کر دیا۔ انیس بیس کے فرق کے ساتھ وہ ہمیشہ مجھ سے آگے ہوتی۔ اس کے اسائنمنٹس، پروجیکٹس اور پریکٹیکلز ہمیشہ اتنے مربوط اور بہترین ہوتے کہ اساتذہ کو اسے آگے رکھنا پڑتا۔ میں ہمیشہ انیس پر ہوتا اور وہ بیس پر۔ میری شدید محنت کے باوجود وہ مقابلے کی اس دوڑ میں مجھ سے آگے ہی تھی۔ میرے دل میں اس کے خلاف غم و غصہ بڑھتا گیا۔

اسکول میں ہم تین دوستوں کی تکون تھی۔ میں یعنی سلجوق، موحد اور میکس۔ جتنا میکس غصیلا تھا۔ موحد اتنا ہی ٹھنڈا۔ میکس کو ربیعہ مظہر اتنی بری لگتی تھی کہ اس کا بس چلتا تو وہ اس کا مرڈر کر دیتا۔ اس کا اور موحد کا جھگڑا ہمیشہ میں ہی ختم کرواتا۔

''میکسی! پرابلم تو مجھے ہونی چاہئے ربیعہ سے۔ تجھے کیا ہے؟'' میں جھلا کر اس پر الٹ پڑتا۔

''وہ اپنے آپ کو سمجھتی کیا ہے؟'' میکس غصے سے بولا۔

''ظاہر ہے لڑکی اور کیا.....؟'' موحد نے ہنسی دبا کر کہا۔

ہم تینوں ہنس دیئے۔

فائنل سمسٹر نزدیک تھے۔ اس لیے ہم سنجیدگی سے اسٹڈیز میں مصروف تھے۔ اس روز ہم تینوں ہنس دیئے۔

فائنل سمسٹر نزدیک تھے۔ اس لیے ہم سنجیدگی سے اسٹڈیز میں مصروف تھے۔ اس روز ہم تینوں نے اس ہارڈ اور بور لائف روٹین سے نکل کر ہائیڈ پارک میں آؤٹنگ کا پروگرام بنایا تھا۔ میں جیسے ہی تیار ہو کر باہر آیا۔ پورچ میں کھڑی شاہانہ رولز رائس نے میرا دماغ خراب کر دیا، پتا نہیں یہ برطانوی اتنے جمہوریت پسند ہونے کے ساتھ ساتھ رجعت پسند کیوں ہوتے ہیں۔ کہاں ہائیڈ پارک.....؟ برطانوی جمہوریت کی سب سے بڑی نشانی۔ اور کہاں رولز رائس، پچاس سال پرانی کار..... یہ درست تھا کہ میرے پاپا سعد لغاری لندن کے پچیس رچی رچ پرسنز میں سے ایک تھے۔ پورے برٹش، بالکل انہی کی طرح رجعت پسند اور جمہوریت کتنا احمق لگتا

میں اس کار کو لے کر گھومتا ہوا۔ میں نے اسے پاؤں کی ٹھوکر ماری اور ڈرائیور کی حیران نظروں کی پروا کیے بغیر پیدل باہر نکل آیا۔ باہر آ کر میں نے موحد کو کال کر کے پک کرنے کو کہا اور اس کا انتظار کرنے لگا۔ وہ مجھ سے ایک بلاک آگے رہتا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ اپنی کار میں آ گیا۔ میرے بیٹھتے ہی پوچھنا لگا۔

''خیریت؟ موڈ کیوں خراب ہے؟''

''کچھ نہیں۔'' میں نے مختصر جواب دیا۔

اس نے مزید اصرار نہیں کیا، وہ جانتا تھا جب میرا موڈ ٹھیک ہوگا تو میں خود بتا دوں گا۔

ایک بھرپور شام گزار کر جب میں اگلے دن اسکول پہنچا تو ایک نئی خبر میری منتظر تھی۔ اسکول میں گیمز کا ویک شروع ہو رہا تھا، میں اپنے اسکول کا بیڈمنٹن کا بہترین کھلاڑی تھا، آج تک کوئی مجھے ہرا نہیں سکا تھا، اس بار میرا حصہ لینے کا کوئی ارادہ نہیں تھا کیونکہ میں کچھ عرصے سے آؤٹ آف پریکٹس تھا۔ لیکن اسکول آ کر مجھے پتا چلا کہ میکس نے بیڈمنٹن کے میچ کے لیے میرا نام دے دیا تھا۔

''میکس! میرا موڈ نہیں تھا یار، تم مجھ سے تو پوچھ لیتے۔''

''کیوں موڈ نہیں تھا؟'' وہ لائبریری کا خیال کر کے دبی آواز میں بولا۔

''پریکٹس نہیں کی میں نے۔'' میں جھنجلا کر بولا۔

''تو اب کرنا شروع کر دو۔''

''لیکن کیوں.....؟'' میری آواز بلند ہوئی۔

موحد نے ہم دونوں کو گھور کر دیکھا اور باہر چلنے کا شارہ کیا۔ باہر آتے ہی میکس مجھ پر الٹا۔

''تمہیں پتا ہے میں نے تمہارا نام کیوں دیا ہے؟''

''کیوں؟'' میں نے حیرت سے اس کے تاثرات جانچے۔

''تمہیں پتا ہے حریف کون ہے؟''

''کون ہے؟ اینڈریو ہوگا اور کون..... ہر بار ہار جاتا ہے پھر بھی حصہ ضرور لیتا ہے۔'' میں نے منہ بنایا۔

''نہیں، وہ نہیں ہے۔ اس بار تمہاری حریف ''ربیعہ مظہر'' ہے۔'' اس نے دھماکا کیا۔

اوہ..... تو وہ ہے۔

''بالکل..... وہ تجھے ہرانا چاہتی ہے۔ سلجوقی اور تجھے جیتنا ہے۔ مجھے پتا ہے بیڈمنٹن تجھ سے اچھا کوئی کھیل ہی نہیں سکتا۔'' میکس جوش سے بولا تھا۔

''دیکھ لیتے ہیں۔'' میں نے سر جھٹکا۔

''پھر تم..... کھیل رہے ہو نا؟''

''بالکل.....'' میں نے مسکرا کر کہا۔

اس نے خوشی سے نعرہ لگایا اور مجھ سے لپٹ گیا۔ میں نے پریکٹس شروع کر دی۔ میچ کے مقررہ دن میں بے حد پرجوش تھا اور اپنی جیت کے بارے میں پر یقین بھی۔ جب گیم شروع ہوا اور وہ آئی تو میں اسے دیکھ کر ایک لمحے کو حیران رہ گیا۔ سفید ٹی شرٹ اور سفید ٹراؤزر میں وہ امن کی فاختہ نظر آتی تھی۔ میرے لبوں پر استہزائیہ مسکراہٹ آ گئی۔ کھیل شروع ہوا۔ ابتدائی راؤنڈ میں ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ آسان ہدف نہیں تھی۔ درمیان میں آ کر میچ بہت مشکل ہو گیا۔ مگر وہ ہار گئی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ جان بوجھ کر ہاری تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے مجھے مبارکباد دی تھی۔ جب میں گراؤنڈ سے باہر آیا تو میرے دوستوں اور مداحوں کا ایک ہجوم میرا منتظر تھا۔ رات میں سلور کلب میں ٹریٹ کا وعدہ کر کے جب میں گھر لوٹا تو حیرت انگیز طور پر پاپا گھر پر تھے۔ انہوں نے مجھے دیکھتے ہی نعرہ مارا۔

''آ گیا میرا شیر! جیت کر آیا ہے۔'' وہ مجھ سے لپٹ گئے۔ میں حیران ہوا۔

''آپ کو..... کیسے پتا چلا؟''

''تمہارے اتنے دوستوں میں سے کوئی بھی مجھے فون کر سکتا ہے۔'' وہ مسکرا کر بولے۔

''اچھا۔ یہ بتاؤں حریف کون تھا؟'' وہ جوش سے پوچھنے لگے۔

''ربیعہ مظہر۔'' میرا منہ کڑوا ہو گیا۔

''اچھا۔ چلو جاؤ فریش ہو جاؤ میں تمہاری ماما کو کھانا لگوانے کا کہتا ہوں۔'' وہ حریف کے نام پر غور کیے بغیر بولے۔ میں اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

فائنل سیمسٹر کے رزلٹ سے پہلے ہی میں پاپا کا آفس جوائن کر چکا تھا۔ جس دن رزلٹ اناؤنس ہوا میں پاپا کے ساتھ ایک میٹنگ میں تھا۔ صرف چند مارکس کے فرق کے ساتھ

ربیعہ مظہر ایک بار پھر میدان مار گئی تھی۔ پاپا بے حد خوش تھے مگر میری خوشی پر جیسے اوس سی پڑ گئی۔ یہ خبر مجھے میکس نے دی تھی اور حسب معمول وہ خاصا تپا ہوا تھا۔ میں سب سے معذرت کرتا فون لے کر میٹنگ روم سے باہر آ گیا۔

''اٹس او کے، میکس۔ غصہ مت کرو۔''

''سلجوق! یار وہ لڑکی.....''

''وہ مجھ سے زیادہ ہارڈ ورکنگ ہے میکسی۔'' میں نے فراخدلی سے کہا۔

وہ چونکا تھا۔ شاید میری فراخدلی پر۔

''او کے۔'' وہ دھیرے سے بولا۔

''پھر شام میں پارٹی رکھتے ہیں۔''

''کہاں؟'' میکس نے پوچھا۔

''میرے گھر میں۔'' میں نے کہا۔

کچھ دیر بات کرنے کے بعد میں نے فون بند کر کے جیب میں ڈالا اور سست قدموں سے لفٹ کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ راستے میں ہی پاپا کا فون آ گیا۔ میں نے ارگرد نظر دوڑائی، یہ بے حد معروف و مصروف شاہراہ تھی اور میں قطعی طور پر فون اٹھانے کا رسک نہیں لے سکتا تھا ورنہ کانسٹیبل فوراً ٹکٹ دے دیتا۔ میں نے تھوڑی دیر سوچا۔ فون مسلسل بج رہا تھا۔ میں نے فون لیس کر کے اسپیکر آن کیا اور فون ڈیش بورڈ پر رکھ دیا۔

''جی پاپا۔''

''گھر جا رہے ہو؟''

''جی..... کیوں! کوئی کام؟''

''بالکل۔ میں نے تو اپنے دوستوں کو انفارم بھی کر دیا ہے۔'' میں ہنسا۔

''مظہر کی فیملی کو بھی انوائٹ کر لیں؟''

''کر لیں۔ پوچھنے کی کیا ضرورت ہے.....؟''

''مظہر کی بیٹی بھی آئے گی سوچ لو۔'' وہ شرارت سے مسکرائے۔

''پاپا..... پلیز.....'' میرا موڈ آف ہو گیا۔ وہ چند لمحے خاموش رہے۔

''سلجوق! تم سچائی تسلیم کرنے سے اتنے گریزاں کیوں ہو؟'' وہ قدرے سرد مہری

سے بولے۔

''ایسی بات نہیں پاپا۔ مجھے تھوڑا وقت چاہیے۔'' میں سنبھل گیا۔

''تو ٹھیک ہے۔ تم وقت لے لو۔ میں انہیں انوائٹ نہیں کرتا۔

''لیکن کب تک.....''

''چند ماہ۔''

دوسری طرف سے فون بند ہو گیا۔ میں نے ایک طویل سانس لے کر اندر کی کثافت کو باہر نکالا اور رستے پر نظر جما دی۔

مظہر بخاری پاپا کے بہت اچھے دوست تھے۔ پاپا کے برعکس انہیں بزنس میں کوئی دلچسپی نہیں تھی، وہ اپنا ڈیپارٹمنٹل اسٹور چلا رہے تھے۔ مظہر انکل کی بیٹی سے پاپا نے میرے بچپن میں ہی میری انگیجمنٹ کر دی تھی۔ مجھے مظہر انکل کی بیٹی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور میں نے اسے آج تک نہیں دیکھا تھا، شاید یہ کچھ غیر حقیقی بات بھی تھی مگر یہی سچ تھا۔ میں نے بہت بار کوشش کی کہ پاپا سے بات کر کے اس رشتے کو ختم کر دوں مگر یہ میری زندگی کا واحد معاملہ تھا۔ جس پر میرے جمہوریت پسند پاپا ایک آمر کی حیثیت اختیار کر جاتے تھے اور کچھ سننے کو تیار نہیں ہوتے تھے۔ میں جانتا تھا کہ جلد یا بدیر مجھے یہ شادی کرنا ہی ہو گی مگر میں فی الوقت اسے ٹال ہی سکتا تھا جو کہ میں بخوبی کر رہا تھا۔

پاپا کو پندرہ دن کے لیے مانچسٹر جانا تھا وہ مجھے ڈھیر ساری باتیں سمجھا کر اور ہدایت دے کر رخصت ہو گئے۔

اگلے دن موحد کا فون آیا تو میں سخت مصروف تھا۔ اس نے مجھے خاصی سنسنی خیز خبر سنائی۔

''ربیعہ مظہر جاب ڈھونڈ رہی ہے۔''

''اوہ..... یہ تو اچھی بات ہے۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آیا کہ ربیعہ مظہر سے متعلق ہر خبر تم لوگ مجھے ہی کیوں دیتے ہو؟'' میرے لہجے میں نہ چاہتے ہوئے بھی رکھائی آ گئی۔

''وہ اس لیے سلجوق لغاری! اتنا بڑا ٹیلنٹ تمہارے کسی مخالف کے پاس بھی جا سکتا ہے۔'' وہ طنز سے بولا۔

''تو جانے دو۔'' میں نے فون رکھ دیا۔ مگر در پردہ سوچوں کے دریچے وا ہو گئے۔ ایک پلان بہت واضح ہوتا گیا۔ اگلے دو دن میں، میں نے اپنے ذرائع سے معلوم کیا کہ ربیعہ مظہر نے

کہاں اپلائی کیا تھا۔ وہ دو فرمز تھیں اور دونوں ہی ٹاپ کلاس۔ ایک میں کسی اور کو پہلے ہی سلیکٹ کیا جا چکا تھا جبکہ دوسری میں ربیعہ کے چانسز تھے اور اسے وہاں سے ڈس اپائنٹ کرانے کے لیے مجھے صرف ایک فون کرنا پڑا تھا۔ پاپا کے بنائے ہوئے کونیکٹس میرے کام آئے تھے۔ اگلے دن میری فرم کی طرف سے ویکنسی کا ایڈوے دیا گیا۔ ایک سیٹ کے لیے امیدواروں کا اتنا ہجوم دیکھ کر مجھے حیرت سی ہوئی تھی، تاہم انٹرویو مسٹر ولسن کو کرنا تھے۔ اس لیے میں بے فکری سے بیٹھا اپنے آفس میں دیگر کام نمٹاتا رہا۔ پھر وہ آئی۔ اپنے آفس کی اسکرین پر میں نے دیکھا، لانگ اسکرٹ اور براؤن چیک والی ٹاپ میں سر پر فر والی ٹوپی پہنے کھلے بالوں کے ساتھ وہ واقعی کوئی چیز لگ رہی تھی۔ میں اس وقت چونکا جب ولسن نے اسے اندر جانے کا اشارہ کیا۔

کچھ دیر بعد وہ اندر آ گئی۔ میری پشت اس کی طرف تھی۔ میں نے اپنے پیچھے اس کی آواز سنی۔

''ہیلو۔''

میں نے آہستگی سے راکنگ چیئر موڑی۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے کا رنگ ایک لمحے کو بدلا۔

''ہیلو..... پلیز.....'' میں نے بے تاثر چہرے کے ساتھ اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

اس نے بیٹھتے ہوئے فائل میری سمت بڑھائی۔ میں نے رسمی طور پر فائل دیکھی اور اس سے خالصتاً پروفیشنل انداز میں انٹرویو کرنا شروع کر دیا۔ وہ کنفیوژ ہوئے بغیر میرے سوالوں کے جواب دیتی رہی۔ کچھ دیر بعد میں نے اسے جانے کا اشارہ کیا اور ساتھ ہی فائل اس کی طرف بڑھائی۔ اس نے فائل تھامتے ہوئے تھینکس کہا اور مستحکم قدموں سے باہر نکل گئی۔

اگلے دن اسے اپائنٹمنٹ لیٹر بھیج دیا گیا۔ تین دن بعد اس نے جوائن کر لیا۔ وہ براہ راست میرے انڈر آئی تھی اور چند دنوں میں ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ واقعی جینئس اور ہارڈ ورکنگ تھی۔ پاپا آئے اور انہوں نے بھی اس اضافے کو پسند کیا تھا۔ میرا رویہ اس کے ساتھ بالکل پروفیشنل باس کا سا تھا۔ کام کے معاملے میں اسٹرکٹ اور کسی حد تک روڈ۔ اسے ہماری فرم میں کام کرتے ہوئے ایک ماہ ہونے والا تھا۔ آج مجھے اس کے ساتھ ایک اہم پروجیکٹ ڈسکس کرنا تھا۔ میں نے آفس آتے ہی اپنی سیکرٹری جسیکا سے ربیعہ کا پوچھا۔

''سر! مس ربیعہ لیو پر ہیں۔''

''وہاٹ! لیکن کیوں.....؟ مجھے اس کی غیر ذمہ داری پر بے انتہا غصہ آیا۔'' فون کرواسے۔''

جسیکا نے اسے فون لگایا مگر فون آنسرنگ پر تھا۔ میں نے جسیکا کو جانے کا اشارہ کیا اور خود پاپا کو فون کیا۔

''پاپا کہاں ہیں آپ؟''

''خیریت؟ میں مظہر کی طرف ہوں۔''

''کیوں؟ آپ تو آفس آ رہے تھے۔ سب ٹھیک ہے نا؟'' میں ٹھٹک گیا۔

''مظہر کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ اس لیے میں نے سوچا کہ حال احوال دریافت کرتا جاؤں۔''

''اوہ..... کب تک آئیں گے؟ مجھے آپ سے وہ ''آرنلڈز'' کا پروجیکٹ ڈسکس کرنا ہے۔'' میں نے غیر محسوس انداز میں ایک پرسکون سانس لیا اور ہلکے پھلکے انداز میں پوچھا۔

''ہاں۔ کچھ ہی دیر میں نکلتا ہوں۔''

''اوکے۔'' میں نے فون رکھ دیا۔

مجھے ربیعہ مظہر کے نہ آنے کا افسوس تھا۔

''آرنلڈز'' کے پروجیکٹ کا پریزنٹیشن اسے ہی تیار کرنا تھا۔ میں نے سر جھٹک کر اس کا خیال جھٹکا اور سامنے پڑی فائل کھول لی۔

اگلی صبح ناشتے کی ٹیبل پر پاپا کچھ پریشان سے تھے۔ میں نے چائے کے سپ لیتے ہوئے دو تین بار ان کا چہرہ دیکھا کہ شاید وہ کچھ بتا دیں مگر وہ گہری خاموشی سے ناشتے میں مصروف تھے۔

''پاپا! کیا بات ہے؟ میں کب سے دیکھ رہا ہوں آپ کچھ پریشان سے ہیں۔'' مجھ سے رہا نہ گیا تو میں بول پڑا۔

''مظہر کی طبیعت زیادہ خراب ہے سلجو! ہو سکتا ہے اسے ہسپتال لے کے جانا پڑے۔''

''کیا بیماری ہے انہیں؟'' میں چونکا تھا۔

''ہارٹ پرابلم۔'' انہوں نے پریشان سے ہونٹ چبائے۔

''اوہ..... نو..... تو آپ کو چاہیے کہ انہیں کراموبل میں ایڈمٹ کرا دیں۔'' میں نے

لندن کے مشہور ہسپتال کا نام لیا۔

''یہی سوچ رہا ہوں میں۔ ہوسکتا ہے آج میں آفس نہ آؤں۔ تم سب دیکھ لینا۔''

''جی پاپا! میں سب سنبھال لوں گا۔'' میں نے انہیں تسلی دی۔

ربیعہ مظہر آج پھر غائب تھی۔ مجھے طیش آ گیا۔ میں نے جسیکا سے اس کا نمبر لیا اور اسے کال ملائی۔ تیسری بیل پر فون کاٹ دیا گیا۔ احساس توہین سے میں سلگ اٹھا۔ میں نے ایک بار پھر کال ملائی۔ چوتھی بیل پر فون اٹھا لیا گیا۔

''ہیلو۔'' ربیعہ کا لہجہ بھاری تھا۔

''سلجوق ہیر۔'' میں نے دانت بھینچ کر کہا۔

''جی سر۔'' وہ گڑبڑا گئی۔

''تم ایک غیر ذمہ دار اور بدتہذیب لڑکی ہو۔ ایک تم نے آفس میں اپنی لیو کے بارے میں انفارم نہیں کیا اور دوسرے میرا فون ڈسکنکٹ کر دیا۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔

''سس..... سوری..... سر۔''

''وہاٹ سوری۔ تم کو اپنے اس غیر ذمہ دارانہ رویے کی وضاحت کرنا ہوگی اور کل ''آرنلڈز'' کے لیے Presentation بھی دینا ہے۔ کیا تیار ہے اس کے لیے؟'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''جی سر میں تیار کر لوں گی۔'' اس کے دھیمے لہجے نے میری پرغرور شخصیت کو عجیب سی تسکین دی۔

''اوکے'' میں نے کھٹاک سے فون بند کر دیا۔

میرے غصے میں تھوڑی کمی آ گئی شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ میں نے نہایت نپے تلے انداز میں ربیعہ مظہر کو اس کی اصلیت یاد دلائی تھی کہ بہر حال کچھ دیر بعد مجھے کمپنی کے ڈائریکٹرز کے ساتھ میٹنگ کرنا تھی اس لیے میں اٹھ کھڑا ہوا۔ پاپا سارا دن آفس نہیں آ سکے تھے، ایک بار جب ان کا فون آیا تو میں میٹنگ میں بزی تھا اور فون Office Mood پر اس لیے ان کی کال از خود ڈسکنکٹ ہو گئی۔

ایک بور، ٹف اور بزنس ڈے گزارنے کے بعد گھر جاتے ہوئے میں کتنی دیر اپنی چند ماہ کی زندگی کو سوچتا رہا۔ اسٹوڈنٹ لائف کتنی خوب صورت ہوتی ہے۔ لائف کا گولڈن پیریڈ، جو

کہ بالکل ٹینشن فری ہوتا ہے۔ مجھے لگا میرا دماغ کھسک گیا ہو۔ میں نے گاڑی موڑی اور خواہ مخواہ ان جگہوں سے ہوتے ہوئے گزرنے لگا جہاں میں نے موحد اور میکس کے ساتھ ڈھیر سارے یادگار پل گزارے تھے، یادگار اور خوبصورت پل جو کہ اب ایک خواب محسوس ہوتے تھے۔ ہائیڈ پارک میں گزاری گئی شامیں، رابرٹ ڈکر ہال میں درجنوں بار دیکھی گئی سمفنی آرکسٹرا کی پرفارمنس، روز پکچر ہاؤس میں دیکھی گئی، موویز، دریائے ٹیمز کے کنارے گزارے خوب صورت حال لمحات، بگ بین کلاک ٹاور اور پارلیمنٹ ہاؤس سے ہوتے ہوئے میں نے کار کا رخ واپس موڑ لیا۔ مجھے لگا یہ اعصابی کشیدگی، تھکان اور ذہنی انتشار مجھے پاگل کر دے گا۔ مجھے شدت سے اپنے دوستوں کی کمی محسوس ہوئی۔ موحد ان دنوں اپنے بزنس کے سلسلے میں لیڈز گیا ہوا تھا جبکہ میکس اپنے میوزک بینڈ کا پہلا البم ریلیز کرنے کی تیاریوں میں تھا۔

جب میں گھر پہنچا تو گاڑی پارک کرتے ہوئے مجھے خود پر ہنسی آئی بلکہ اپنی بے وقوفی پر آئی۔ میرے ساتھ کچھ انوکھا تو نہیں ہوا تھا، ہر ایک کو پریکٹیکل لائف میں آنے کے بعد اپنی بے فکری، شوخیاں، ہنگامے بھولنا پڑتے ہیں۔ میں نے ماما سے کھانا لگانے کا کہا اور خود فریش ہونے کے لیے چل دیا۔

☆☆☆

ہم اس وقت ''آرنلڈز'' کے پریزنٹیشن ہال میں موجود تھے اور دو گلاس پانی پینے کے باوجود میرے غصے کا گراف نیچے نہیں آ سکا تھا اور اس کی وجہ ربیعہ مظہر ہی تھی۔ وہ موجود تھی مگر اتنے معمولی حلیے میں کہ یوں لگتا تھا جیسے نیند سے اٹھ کر سیدھی یہاں آ گئی ہو۔ سوجی ہوئی متورم آنکھیں لیے بالوں کو یونہی سمیٹ کر ہیر کیچر لگائے، جینز اور لوز شرٹ میں وہ بالکل بھی متاثر کن نہیں لگ رہی تھی۔ مجھے خدشہ تھا کہ اس کنڈیشن میں شاید ہی وہ اچھی Presentation دے پائے اور ایسا ہی ہوا، ایسا نہیں تھا کہ اس نے پہلے کبھی اس کا تجربہ نہیں کیا تھا، وہ بہت اچھی Presentation تھی مگر آج وہ اتنی کنفیوژ اور فرسٹریٹڈ لگ رہی تھی کہ میں نے اسی وقت اس پروجیکٹ پر فاتحہ پڑھ لی۔ ایک تو اس کا خراب حلیہ، دوسرے کنفیوژن، وہ بات کرتے ہوئے بار بار رک جاتی، جیسے اگلی بات کے لیے لفظ ڈھونڈ رہی ہو، صاف ظاہر تھا کہ اس نے بالکل تیاری نہیں کی تھی۔ میرے غصے کا گراف بڑھتا جا رہا تھا۔ پاپا کے بغیر یہ میرا پہلا پروجیکٹ تھا جو کہ میرے کیریئر کے لیے ایک بڑا بریک تھرو بن سکتا تھا اور جس کے لیے میں نے ڈھیر ساری محنت

کی تھی مگر ربیعہ مظہر نے سب کچھ خاک میں ملا دیا تھا۔

جیسے ہی ہم لوگ آفس لوٹے میں نے سب ورکرز کے سامنے اس کی اچھی خاصی کلاس لی۔ مجھے خود نہیں پتا تھا کہ غصے اور شدید طیش کی حالات میں میرے منہ سے کیا کچھ نکل رہا تھا۔ بھیگی آنکھوں کے ساتھ اس کے لرزتے لب بار بار کچھ کہنے کی کوشش میں کھلتے اور پھر ساکت ہو جاتے۔ اپنا سارا غصہ نکالنے کے بعد میں اپنے روم میں آ گیا۔

''جسیکا، نوفون، نو وزیٹر۔'' میں نے انٹرکام پر کہا۔

''جی سر۔'' میرے غصے سے شاید وہ بھی ڈری ہوئی تھی۔

کچھ ہی دیر میں ربیعہ مظہر دروازہ دھکیلتی ہوئی اندر آئی اس کے پیچھے جسیکا بھی تھی، اسے روکتی ہوئی۔ ربیعہ نے ایک پیپر تیزی سے میرے سامنے پھینکا۔

''میں اسے مزید برداشت نہیں کر سکتی۔'' بائیں ہاتھ کی پشت سے اپنے آنسو صاف کرتی وہ جتنی تیزی سے آئی تھی اتنی تیزی سے مڑ گئی۔ میں ٹھٹکا اور اگلے ہی لمحے میں نے سامنے پڑے پیپر پر نظر دوڑائی۔ میرے سامنے ربیعہ مظہر کا ریزائن دھرا تھا۔

اسی شام مجھے پاپا کا فون آ گیا، وہ ابھی تک مظہر انکل کی طرف تھے۔ انہوں نے بتایا کہ مظہر انکل کو اب کراموئیل ہسپتال سے گھر شفٹ کیا جا چکا تھا، انہیں انجائنا کا اٹیک ہوا تھا لیکن اب وہ کافی ری کور کر چکے تھے۔ انہوں نے مجھے فوراً وہاں آنے کا کہا اس کے ساتھ ہی مجھے وہاں کا ایڈریس سمجھایا۔

''سب ٹھیک ہے نا پاپا؟'' میں حیران اور کسی قدر پریشان تھا۔

''ہاں ٹھیک ہے، تم آ جاؤ۔'' انہوں نے فون رکھ دیا۔

میں نے فون رکھا اور کس قدر تردد سے نکل پڑا۔ پتا بہت آسان تھا۔ وہاں خاصی چہل پہل نظر آ رہی تھی۔ پاپا مجھے سامنے ہی مل گئے۔ انہوں نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

''ربیعہ کے ساتھ تمہاری کیا بات ہوئی تھی؟''

''اوہ..... تو اس نے آپ کو انفارم کر دیا۔ اس کا غیر ذمہ دارانہ رویہ دیکھا آپ نے۔ اس کی وجہ سے آرنلڈز'' کا پروجیکٹ ہمارے ہاتھ سے نکل گیا۔'' میں نے تلخی سے کہا۔

وہ چند لمحے خاموشی سے مجھے دیکھتے رہے۔

''یہاں سب ٹھیک ہے نا، مظہر انکل کیسے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''مظہر ٹھیک ہے، تم چاہتے تھے نا کہ میں تمہیں چند ماہ ڈسٹرب نہ کروں شادی کے لیے۔ میرے خیال میں تمہاری شادی رکھ دوں۔ مگر مظہر کی وجہ سے مجھے یہ سب ذرا جلدی کرنا پڑا مگر خیر جلد یا بدیر..... کیا فرق پڑتا ہے۔ آج تمہارا نکاح ہے، ولیمہ ہم سب مظہر کی طبیعت ٹھیک ہونے کے بعد دے دیں گے۔ ٹھیک تو وہ اب بھی ہے مگر میں چاہتا ہوں کہ وہ پوری طرح صحت یاب ہو جائے۔ تمہارا کیریئر سیٹ ہو چکا ہے، میرے خیال سے تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہئے۔'' انہوں نے اتنے سکون سے بات مکمل کی کہ میرے لیے کوئی گنجائش نہیں چھوڑی تھی۔ میں خاموشی سے ان کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

''تمہیں اعتراض ہے؟'' انہوں نے میرے تاثرات دیکھ کر نتیجہ اخذ کیا۔

''نہیں پاپا۔'' میں نے خود کو سنبھالا۔

''اوکے، آؤ میرے ساتھ۔'' انہوں نے مجھے اپنے ساتھ لیا اور اندر کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ وسیع و عریض سٹنگ روم میں پاپا اور مظہر انکل کے چیدہ چیدہ دوست احباب موجود تھے۔ سب سے ملنے کے بعد مجھے بیٹھے کچھ ہی دیر گزری تھی کہ پاپا نے مجھے اپنے پاس بلایا اور ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ ایک کمرے کے بند دروازے پر آ کر وہ رک گئے۔ میں نے استفہامیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

''ربیعہ تم سے بات کرنا چاہتی ہے۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بولے۔

''میں اس سے اس وقت کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔'' میں نے خود کو حتی الامکان پر سکون رکھا۔ پاپا چند لمحے مجھے دیکھتے رہے۔

''ہو سکتا ہے بات ضروری ہو۔''

''پلیز پاپا! میں نے کہا نا۔'' میں جھنجلا کر بولا۔

''اوکے، انہوں نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔'' جاؤ۔'' میں خاموشی سے واپس پلٹ آیا۔

کچھ دیر بعد نکاح کی تقریب شروع ہوئی۔ ماما اس موقع پر کمرے میں مظہر انکل کی بیٹی کے پاس موجود تھی اور مجھے خود پر ہنسی آ رہی تھی، میں اپنی ہونے والی بیوی کا نام تک نہیں جانتا تھا۔ لندن جیسے آزاد، جمہوریت پسند اور ماڈرن شہر میں رہتے ہوئے میں نے اسے کبھی دیکھا نہیں، کبھی اس سے ملا نہیں۔ بظاہر ناممکن سی بات لگتی تھی مگر حقیقت میں پہلی بار مجھے اس بات پر

بھی حیرت ہو رہی تھی کہ مجھے تو اس رشتے میں دلچسپی نہیں تھی، اسی لیے میں نے کبھی اس سے ملنے کی کوشش نہیں کی مگر اس نے بھی تو نہیں کی تھی۔ کیا اسے بھی مجھ سے کوئی سروکار نہیں تھا؟ اس سوال نے مجھے عجیب سے انداز میں جھنجوڑا۔ اس معاملے کو میں پھر ٹال کر فی الوقت نکاح خواں کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''کیا آپ کا ربیعہ لغاری ولد مظہر لغاری بعوض حق مہر.....'' میں نکاح خواں کا پورا جملہ نہیں سن سکا۔

''ربیعہ..... ربیعہ مظہر..... ضروری نہیں دنیا میں صرف ایک ہی ربیعہ مظہر ہو..... یہ..... کوئی اور بھی تو ہو سکتی ہے، مگر..... اتنی مماثلت..... بالکل وہی ترتیب..... ربیعہ مظہر.....'' میں خود کو تسلی دیتے دیتے پھر الجھ گیا۔ میں زیادہ دیر الجھا نہیں رہ سکا۔ پاپا نے مجھے نکاح خواں کی طرف متوجہ کر لیا۔

نکاح کے بعد ڈنر سرو کر دیا گیا۔ مجھے موحد اور میکس بے حد یاد آ رہے تھے۔ کچھ دیر بعد دلہن کے آنے کا غلغلہ اٹھا۔ سفینہ آنٹی جو کہ ماما کی بہت اچھی دوست بھی تھیں، انہوں نے مجھے اپنے ساتھ جگہ بنانے کا اشارہ کیا۔ میرے دائیں طرف مظہر انکل موجود تھے، اگرچہ وہ کافی کمزور لگ رہے تھے مگر اس کے باوجود ان کا چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا۔ میری طرح ربیعہ بھی ان کی اکلوتی بیٹی تھی۔ میں آہستگی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ وسیع و عریض سٹنگ روم کے داخلی دروازے سے ماما اور دو تین لڑکیاں اسے تھامے ہوئے اندر داخل ہوئیں میری سانس تھم گئی۔ نظر بندھ گئی یا شاید واپس آنے سے انکاری ہو گئی، کسی نے بہت سکون سے میرے پاؤں تلے سے زمین کھینچ لی تھی۔

وہ ''وہی'' تھی۔

میری حریف ''ربیعہ مظہر۔''

میں یک ٹک اسے دیکھ رہا تھا۔ پنک کلر کے لمبے سے لبادے نما فراک میں بالوں کو بہت اسٹائلش طریقے سے باندھے، شانوں پر نیٹ کا اسکارف ڈالے چمکتے گلابی چہرے کے ساتھ وہ میرے روبرو تھی۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اس کی خاموشی پکارتی تھی۔

''تم ہار گئے سلجوق لغاری..... تم اپنی زندگی کی سب سے بڑی بازی ہار گئے۔''

وہ واقعی میری حریف تھی۔ میرے اندر الاؤ جل اٹھے تھے، میرے اندر مختلف آوازیں گڈمڈ ہو رہی تھیں، پاپا کے جملے اودھم مچا رہے تھے۔

''حریف کون تھا؟''

''ربیعہ مظہر''

''سوچ لو مظہر کی بیٹی بھی آئے گی۔''

''ربیعہ از آ جینئس''

''تمہاری ربیعہ سے کیا بات ہوئی؟''

''سر وہ لیو پر ہیں۔''

''ربیعہ تم سے بات کرنا چاہتی ہے۔''

میں خاموش تھا، بالکل خاموش..... اور شاید وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ میری خاموشی کتنے بڑے طوفان کا پیش خیمہ ہو سکتی تھی۔ اس کی جھکی نظریں اٹھ نہ سکیں تھیں۔ تصویریں بن رہی تھیں، کچھ دیر بعد سب لوگ روانگی کے لیے اٹھ گئے۔ وہ میری کار کی فرنٹ سیٹ پر موجود تھی۔ اس کے پاس سے دھیمی سی اٹھتی خوشبو نے گاڑی کے ماحول کو مہکا دیا تھا۔ میں نے گہری سانس لے کر خود پر قابو پایا اور گاڑی اسٹارٹ کی۔ میرے اعصاب وائلن کے تاروں کی مانند تنے ہوئے تھے۔ اندر ہی اندر سوالات کا پکتا جوالہ مکھی کسی بھی لمحے پھٹ پڑنے کو تیار تھا۔ ''مظہر ہاؤس'' سے لغاری ہاؤس کا فاصلہ میں نے کیسے طے کیا تھا میں خود نہیں جانتا تھا۔ ماما اور پاپا کی گاڑی ہم سے پہلے اندر داخل ہوئی۔ ماما اسے لے کر میرے کمرے کی طرف چل پڑیں۔ پاپا نے مجھے اپنے پاس بٹھا لیا۔

''سلجوق! بیٹے تم خوش ہو ناں؟'' انہوں نے بے چینی سے پوچھا۔

''جی پاپا'' ایک مسکراہٹ اپنے لبوں پر لانے کے لیے مجھے کتنی مشقت کرنا پڑی تھی، یہ میں ہی جانتا تھا۔

''ربیعہ بہت اچھی، بہت پیاری بچی ہے سلجوق، جوں جوں تم اس کو قریب سے جانو گے اس سے محبت کرنے لگو گے۔'' انہوں نے چمکتی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور میرا شانہ تھپتھپایا۔ ''جاؤ۔''

میں اٹھا اور سست قدموں سے اپنے کمرے کی طرف چل پڑا۔ دروازے پر مجھے ماما مل گئیں۔ انہوں نے میری پیشانی کو چوما اور دعا دے کر مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ میں خود کو کمپوز کرتا اندر داخل ہو گیا۔ مڑ کر دروازہ بند کیا اور پھر لاک کر دیا۔ وہ کمرے کے وسط میں کھڑی

تھی۔ چہرے سے بے چینی اور ہراس ٹپک رہا تھا۔ میں آہستہ آہستہ چلتا اس کے مقابل آ گیا۔

''بہت شوق ہے، تمہیں مجھے ہرانے کا..... ہاں..... بولو۔'' میرا لہجہ اتنا سرد تھا کہ وہ زرد پڑ گئی۔

''چلو میں تمہیں بتاتا ہوں کہ اصلی ہار کیا ہوتی ہے۔''

میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ صرف ایک لمحہ لگا تھا مجھے انسانیت کی بلندیوں سے اتر کر حیوانیت کی پستیوں میں گرنے میں۔ میں نے اپنے اندر جمع سارا غصہ، غبار، نفرت اور ذلالت باہر نکال دی۔ اس کی معافیاں، تلافیاں شاید میں نے سنی ہی نہیں، شاید وہ مجھے کچھ بتانا چاہتی تھی مگر مجھے تو صرف اس کی گھٹی گھٹی سسکیاں سنائی دے رہی تھیں، جو میرے اندر ایک عجیب سا سکون اور احساس تکبر انڈیل رہی تھیں۔ اگلی صبح بے حد چمکدار اور روشن تھی۔ میرے تکیے کے پاس پڑا اس کا گلابی پھول دار کیچر اس کا احساس دلا رہا تھا مگر وہ خود کہیں نہیں تھی اور ویسے بھی مجھے کیا پروا تھی اس کی۔ میری بلا سے وہ جائے بھاڑ میں۔ میں نے ایک طویل پرسکون شاور لیا۔ اپنے پسندیدہ کلون سے خود کو مہکایا اور آفس چلا آیا۔ پاپا اور ماما رات کی فلائٹ سے دس دن کے لیے نیوجرسی جا چکے تھے۔ شاید اسی لیے انہوں نے جانے سے پہلے اتنا ارجنٹ نکاح کیا تھا تاکہ وہ ربیعہ کو میری کسٹڈی میں دے کر سکون سے جا سکیں۔ نیوجرسی میں پاپا کے تایازاد بھائی رہتے تھے اور ماما کے چند رشتے دار بھی رہتے تھے، جبھی ان کا ٹور دس دن پر محیط تھا۔

ابھی مجھے آفس آئے دس منٹ ہی گزرے تھے اور میں جسیکا کو آج کے اپائنمنٹ کے لیے کال کرنے والا ہی تھا کہ اس کی کال آ گئی۔

''سر! موحد سر، آپ سے ملنا چاہ رہے ہیں۔''

مجھے خوشگوار حیرت نے آ گھیرا۔

''موحد لیڈز سے کب واپس آیا؟'' سوچتے ہوئے میں نے جسیکا کو موحد کو اندر بھیجنے کا کہا اور خود اس کے استقبال کے لیے کھڑا ہو گیا۔ چند سیکنڈز کے بعد دروازہ پش کرتا وہ اندر آ گیا۔ میں اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس کا چہرہ ستا ہوا تھا اور آنکھیں متورم اور بے خوابی کی غماز تھیں۔ حلیہ بھی رف لگ رہا تھا۔

''کیا بات ہے موحد؟ آر یو اوکے؟'' میں ٹیبل کے پیچھے سے نکل آیا۔ وہ مجھ پر جھپٹ پڑا۔ اس نے مجھے شرٹ کے کالر سے تھاما اور دھکیلتے ہوئے دیوار سے لگا دیا۔ میں اتنا زیادہ

حیران تھا کہ فوری طور پر اپنے دفاع کے لیے کچھ نہ کر سکا۔

''تو اتنا کیسے گر سکتا ہے سلجوق! کیسے.....؟ فخر کرتا تھا میں تجھ پر..... تیری دوستی پر..... بہت خوش ہوتا تھا میں تیری کامیابیوں پر..... سراہتا تھا تیری خوبیوں کو..... اور کبھی یہ جان ہی نہیں سکا کہ تو اتنا کم ظرف نکلے گا..... تجھ سے اچھا تو میکسی تھا وہ کھلے عام ربیعہ کے خلاف بولتا تھا کیونکہ وہ میکسی کو اچھی نہیں لگتی تھی اور تب تو اسے خاموش کرا دیتا تھا۔ میں نے کبھی اس وقت یہ نہیں سوچا کہ تیرے اندر ربیعہ کے لیے زہر بھرا ہوا ہے..... تو اتنا گندا انسان ہے سلجوق، مجھے سوچ کر خود سے نفرت ہو رہی ہے کہ تو میرا دوست تھا۔'' وہ غصے سے پاگل ہو رہا تھا۔

''انیف..... اٹس انیف موحد۔'' میں نے جھٹکے سے کالر چھڑایا اور اسے پیچھے ہٹایا۔ ''یہاں بیٹھو اور تمیز سے بات کرو۔'' میں نے اسے کرسی پر بٹھایا اور خود اس کے سامنے ٹیبل پر ٹک گیا۔ وہ چند لمحے مجھے آتشیں نظروں سے گھورتا رہا۔ پھر اس نے مجھے جو کچھ بتایا اس کا خلاصہ کچھ یوں تھا:

''موحد کو جب بھی لمبا سفر بر بنائے کار طے کرنا ہوتا وہ رات کا انتخاب کرتا تھا، کیونکہ وہ بہت ریش ڈرائیونگ کرنے کا عادی تھا اس لیے عموماً وہ بارہ بجے کے بعد اپنا پروگرام بناتا۔ کل بھی اسے لیڈز سے رات گئے واپس آنا تھا۔ جس وقت وہ لندن پہنچا رات کے ڈھائی بج چکے تھے۔ اپنے گھر سے وہ ابھی صرف ایک بلاک پیچھے تھا کہ رات کی تاریکی میں ایک سایہ تیزی سے کار کے سامنے آ گیا۔ موحد کی یہ خاصیت تھی کہ وہ تیز ڈرائیونگ ضرور کرتا تھا مگر اس کے ساتھ ساتھ اس کا اسٹیرنگ پر بھی پورا کنٹرول رہتا تھا۔ اس وقت بھی اگر وہ حاضر دماغی سے کام لیتے ہوئے فوری طور پر بریک نہ لگاتا تو وہ شخص اس کی گاڑی کے نیچے آ کر کچلا جاتا۔ جب وہ پریشان سا گاڑی سے نکلا اور گرے ہوئے شخص کو سیدھا کیا تو اسے جھٹکا لگا۔

وہ ربیعہ مظہر تھی۔

وہ جس قدر پریشان تھا اس سے زیادہ حیران۔ ربیعہ کی ناگفتہ بہ حالت مستزاد اس کے ماتھے سے بہتا خون اور وہ اس قدر بدحواس تھا کہ اپنی تھکن اور گھر جانا بھول کر سیدھا اسے ہسپتال لے گیا۔ جہاں ابتدائی چیک اپ کے بعد اسے ایڈمٹ کر لیا گیا اور اس ابتدائی طبی معائنے سے جو بات سامنے آئی اس نے موحد کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ڈاکٹرز کے مطابق ربیعہ کے ساتھ نہایت درندگی کا سلوک کیا گیا تھا۔ وہ اس قدر پریشان تھا کہ حد نہیں مگر بہت سوچنے پر بھی

اسے کوئی ایسا انسان یاد نہیں آسکا جس سے ربیعہ کی دشمنی ہو بلکہ جو دشمنی میں اس حد تک جا سکتا ہے وہ تو بڑی معصوم اور پیاری لڑکی تھی جو سب سے مسکرا کر ملتی تھی۔ اتنا ظالم کون ہو سکتا تھا؟

صبح کا اجالا ہو چکا تھا۔ موحد کو یاد آیا کہ اسے ربیعہ کے گھر والوں سے پوچھنا چاہئے کہ آیا وہ ربیعہ کی غیر موجودگی سے آگاہ بھی تھے یا نہیں؟ اس نے اپنا سارا والٹ چھان مارا جس کاغذ پر اس نے اپنے دوستوں کے اور کلاس فیلوز کے فون نمبرز لکھے تھے اور تھوڑی سی کوشش کے بعد اسے وہ کاغذ مل گیا۔ خوش قسمتی سے اس میں ربیعہ کا نمبر بھی تھا۔ اس نے ہسپتال سے باہر آ کر نمبر ملایا۔ کچھ دیر بعد فون اٹھا لیا گیا۔

''ہیلو!'' کسی خاتون نے فون اٹھایا۔

''جی مجھے ربیعہ سے بات کرنی ہے۔''

''تم کون.....؟ تمہارا نام؟'' وہ چونک کر بولیں۔

''جی میں موحد ہوں۔ ربیعہ کا کلاس فیلو میں لیڈز میں تھا دو ماہ بعد آج ہی لوٹا ہوں۔''

''اسی لیے تمہیں علم نہیں۔ بیٹا، ربیعہ کی کل شادی ہو گئی۔'' خاتون غالباً مسکرائی تھیں۔

''جی..... مبارک ہو۔'' موحد کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ ''کہاں..... کہاں ہوئی۔ مطلب کون ہے اس کا شوہر؟'' موحد کے سر میں یک دم ہی شدید درد اٹھا تھا۔

''ربیعہ کے پاپا کے دوست کا بیٹا ہے۔ تمہیں بھی علم ہو گا۔ ربیعہ کے ساتھ ہی پڑھتا ہے وہ۔ سلجوق نام ہے اس کا..... سلجوق لغاری۔'' موحد کے سر پر بم پھٹا تھا۔

''جی..... او کے۔'' اس نے فون بند کر دیا۔ وہ گیٹ کے پاس زمین پر گر گیا۔ اس کی نظروں کے سامنے سڑک اور چلتی گاڑیاں گیٹ کیپر اور گراسی لان سب دھندلا گئے۔ اسے یکلخت ہی محسوس ہونے لگا کہ اس کا دل رک رہا تھا۔ وہ چند لمحے ساکت پڑا رہا۔ پھر ہمت کر کے اٹھا اور لڑکھڑاتے قدموں سے ایک طرف چل دیا۔ اس کے ذہن میں اتنے سوال تھے کہ شاید وہ پاگل ہو جاتا۔

''ربیعہ نے سلجوق سے شادی کیسے کر لی؟''

''کیا وہ ایک دوسرے کو پہلے سے جانتے تھے؟''

''کیا ان کے تعلقات اس نہج پر تب پہنچے جب ربیعہ نے سعد لغاری کے آفس میں جاب کی تھی؟''

''کیا ربیعہ مظہر ہی سلجوق کی منگیتر تھی؟''

''سلجوق نے یہ سب کیوں کیا؟''

''وہ ربیعہ کے عتاب سے آگاہ ہے؟''

اسے ان سب سوالوں کے جواب صرف دو ہی افراد دے سکتے تھے۔

نمبر ایک ''ربیعہ مظہر'' نمبر دو ''سلجوق لغاری۔''

ربیعہ اس وقت نیم بے ہوش تھی مگر وہ سلجوق سے بات کر سکتا تھا۔ پہلے اس نے لغاری ہاؤس جانے کا سوچا۔ مگر وہ سعد لغاری کے سامنے کوئی تماشا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے سلجوق کے آفس آنے کا انتظار کرتا رہا۔ اسی دوران ربیعہ کو ہوش آ چکا تھا۔ وہ اتنی خاموش، زرد اور گم صم تھی کہ موحد کو اس پر ترس آنے لگا۔ اس نے موحد سے کوئی بات نہیں کی۔ سوائے اس کہ:

''اب زندہ رہنے کو دل نہیں چاہتا موحد! کیوں بچایا مجھے، مر جانے دیا ہوتا۔'' اس کی بند آنکھوں کے گوشوں سے نکلتے آنسو موحد کا جگر پانی کر گئے۔ وہ بے ساختہ ربیعہ کا ہاتھ تھام کر سسک اٹھا۔

''مجھے اپنا بھائی سمجھو ربیعہ، پلیز مجھے بتاؤ یہ سب کیسے ہوا؟''

وہ چند لمحے یک ٹک چھت کو گھورتی رہی۔ پھر آہستہ آہستہ اس کی آواز کمرے میں گونجنے لگی۔

''دس سال پہلے کی بات ہے مگر وہ دن اچھی طرح سے یاد ہے جب سعد انکل ہمارے گھر آئے تھے۔ انہوں نے ڈیڈی سے میرے اور سلجوق کے رشتے کی بات کی مگر ڈیڈی کسی صورت ہامی بھرنے کو تیار نہ تھے۔ ان دنوں ڈیڈی کو کاروبار میں شدید نقصان ہوا تھا۔ اور وہ تقریباً دیوالیہ ہو چکے تھے۔ سعد انکل نے ڈیڈی کی ہر طرح سے مدد کی اور آخر کار انہیں میرے اور سلجوق کے رشتے پر راضی کر لیا۔ اس کے بعد سعد انکل ہر ویک اینڈ پر ہمارے گھر آتے، وہ مجھ سے سلجوق کی ڈھیروں باتیں کرتے۔ اس وقت میں صرف تیرہ سال کی تھی۔ میں ان کی ہر بات بہت توجہ اور غور سے سنتی اور پھر اسے خود پر اپلائی کرتی۔ سلجوق کیسے چلتا ہے؟ کیسے اٹھا، بیٹھتا ہے؟ کیا کھاتا ہے؟ کیا پسند کرتا ہے کیا ناپسند کرتا ہے۔ غرض سلجوق سے متعلق ہر بات میرے کچے ذہن پر اپنا اثر چھوڑتی گئی۔ میں اپنا مزاج، عادتیں، پسند ناپسند سب بھولتی گئی یاد رہا تو صرف اتنا کہ:

''سلجوق کو کھانے میں چکن اور پیزا پسند ہے۔''

ان دنوں اس نام کا ورد کرنے لگی تھی۔ آہستہ آہستہ وقت گزرتا گیا۔ بچپن رخصت ہوا مگر سلجوق کے لیے میری دیوانگی اور جنون میں اضافہ ہی ہوا۔ لندن اسکول آف آرٹس میں ایڈمیشن لینا میرا خواب تھا مگر جب سعد انکل نے مجھے بتایا کہ سلجوق بزنس پڑھے گا۔ وہ لندن اسکول آف اکنامکس میں ایڈمیشن لے چکا ہے تو میں نے اپنا آرٹسٹ بننے کا خواب گلابی صفحوں میں لپیٹا اور اسے اپنے دل کے نہاں خانوں میں قید کر دیا۔ اپنی بنائی گئی تصاویر کپ بورڈ کے نچلے خانے میں پھینک دیں۔ میں جانتی تھی کہ وہ آسمان پر چمکتا چاند ہے مجھ سے بہت دور، جسے چھونے کی خواہش میں، میں مر جاؤں گی مگر دن رات ایک آواز مجھے اپنے اندر گونجتی سنائی دیتی۔ ''وہ صرف تمہارا ہے ربیعہ۔'' میں چاہتی بھی تو اس حقیقت کو بدل نہیں سکتی تھی۔ میں اس کا سامنا کرنے کے لیے پوری طرح تیار تھی، اور..... پھر وہ آیا مجھ سے میرا اپنا آپ چھین کر لے گیا۔ میں اسے دیکھ کر سانس لینا بھول گئی۔ میں کس کس چیز کو دیکھتی اس کی ہینڈسم پرسنالٹی کو، اس کی چمکدار آنکھوں کو یا اس کی خوب صورت مسکراہٹ کو..... کس کو دیکھتی.....؟ میں جانتی تھی میں اس کے سامنے کچھ بھی نہیں ہوں۔ ایک احساس کمتری مجھے اندر ہی اندر کاٹتا رہتا۔ میں اس کی نظروں میں آنا چاہتی تھی اور جلد ہی میں نے جان لیا کہ وہ اپنی پوزیشن کے بارے میں بہت بچی تھا۔ میں نے دن رات بزنس کی کتابوں میں سر کھپانا شروع کر دیا۔ حالانکہ مجھے بزنس کی الف، ب بھی نہیں آتی تھی۔ میرا مقصد اسے ہرانا یا اس کی پوزیشن سے کک آؤٹ کرنا ہرگز نہیں تھا، میں تو صرف اس جیسی بننا چاہتی تھی اسے بتانا چاہتی تھی کہ: ''میں ربیعہ مظہر ہوں۔'' اور پھر میں نے دیکھا میں بہت جلد اس کی نظروں میں آ گئی مگر میں اس سے نہیں جیتنا چاہتی تھی، میں تو اس کو جیتانا چاہتی تھی..... میری ہر جیت اس کی جیت سے مشروط تھی، مگر کھیل الٹ گیا۔ سعد انکل کا خیال تھا کہ مجھے ان کے آفس میں جاب کرنی چاہیے تاکہ میں سلجوق کو قریب سے جان سکوں۔ اسے سمجھ سکوں، مگر..... صرف چند دنوں میں ہی مجھے احساس ہو گیا کہ سلجوق لغاری ایک خود پرست اور مغرور انسان ہے جو مجھے نیچا دکھانا چاہتا تھا۔ انہی دنوں ڈیڈی کی طبیعت خراب رہنے لگی۔ میرے آفس نہ آنے پر سلجوق کا رویہ میرے ساتھ اتنا روڈ اور حقارت آمیز تھا کہ مجھے رونا آنے لگا، اور اتنا خراب Presentatuon دینے اپر اس نے جب میری شاندار انسلٹ کی تو میرے لیے اور برداشت کرنا ممکن نہ رہا، میں نے ریزائن دیا اور سیدھی گھر آئی۔ ڈیڈی گھر آ چکے

تھے اور حسن اتفاق سے سعد انکل بھی موجود تھے۔ ان کے پوچھنے پر میں نے روتے ہوئے سب بتا دیا، انہوں نے مجھے وہاں سے جانے کا اشارہ کیا اور خود ڈیڈی کے ساتھ مل کر نکاح کا پروگرام سیٹ کرنے لگے۔

میں اس کے لیے قطعی طور پر تیار نہ تھی مگر میری ایک نہ چلی، نکاح ہوا اور میں ہمیشہ کے لیے سلجوق لغاری کے نام لکھ دی گئی۔ حقیقت تو یہ تھی کہ میں برسوں پہلے اس کی ہو گئی تھی، یہ تو دنیاوی رسم و رواج نے مجھے اب اس کا بنایا تھا باضابطہ طور پر۔ میں جانتی تھی وہ مجھے دیکھ کر چونکے گا۔ غصے اور طیش سے پاگل ہو جائے گا۔ لیکن جب میں اسے یہ بتاؤں گی کہ وہ میرے لیے کیا ہے؟ وہ میرے لیے کتنا خاص ہے، وہ میرا عشق ہے، وہ میرا جنون ہے، تو پھر سب ٹھیک ہو جائے گا اور اس نے کیا کیا میرے ساتھ؟ اس نے مجھے ریزہ ریزہ کر کے مٹھی میں ملا دیا، اس نے مجھے مار ڈالا۔ اس نے مجھے بتایا کہ میں کیا ہوں؟ تین کمروں کے گھر میں رہنے والی گھٹیا لڑکی۔ جس کے خواب بہت بلند ہیں جو ہر حال میں اونچائی کو چھونے کی تمنا رکھتی ہے۔ اس نے میرے چہرے پر تھوک دیا موحد۔'' اس نے سر دائیں بائیں بے تابی سے پٹخا اور اذیت سے رونے لگی۔

''اس نے مجھے توڑ دیا موحد..... اس نے میرے اتنے ٹکڑے کر دیئے ہیں کہ میں ساری زندگی خود کو جوڑ نہیں پاؤں گی۔ سعد انکل نے مجھے سلجوق کی زندگی میں شامل کر کے شاید یہ سمجھا کہ انہوں نے مجھے جتا دیا اور اسے ہرا دیا مگر انہوں نے سلجوق کو اور زیادہ زہریلا بنا دیا اور اس نے سارا زہر میری رگوں میں انڈیل دیا..... تم اس کے دوست ہو ناں موحد! مجھے اس کے پاس نہ لے کر جانا..... تمہیں اللہ کا واسطہ..... موحد! مجھے اس سے ڈر لگتا ہے، وہ بہت ظالم ہے وہ مجھے جینے نہیں دے گا..... مجھے بچا لو مجھے اس سے بچا لو موحد'' وہ ہسٹریک ہو گئی۔

''وہ خاموشی سے اٹھا اور ہسپتال سے باہر نکل آیا۔ وہاں سے نکل کر سیدھا سعد لغاری کے آفس چلا آیا جس کے نتیجے میں وہ اس وقت سلجوق کے سامنے تھا۔

موحد چند لمحے آتشیں اور اشکبار نظروں سے گھورتا رہا۔

''میں تجھ پر اور تیری دوستی پر لعنت بھیجتا ہوں سلجوق!'' وہ نفرت سے کہتا میرے آفس سے نکل گیا۔

میں گم صم وہیں بیٹھا تھا۔ یہ ساری باتیں سن کر میرا دماغ ہل کر رہ گیا تھا۔

اس دن میں جلدی آفس سے گھر آ گیا۔ رات تک مجھے تیز بخار ہو چکا تھا۔ شاید یہ

شدید ذہنی ٹینشن کا نتیجہ تھا، یہ احساس کہ میں اس لڑکی کے ساتھ کیا کر چکا ہوں جو زندہ ہی میرے لیے تھی، مجھے مار ڈالنے کو کافی تھا۔ کیوں اتنا گر گیا تھا میں؟ اتنا کم ظرف تھا کہ ایک لڑکی پر اپنا سارا غصہ اور نفرت نکال دی۔ لندن جیسے آزاد اور جمہوریت پسند شہر میں رہ کر بھی میں میل شاؤنزم کا شکار تھا۔ ایسا میل شاؤنسٹ جو ایک لڑکی کو اپنے سے برتر اور اعلیٰ مقام پر نہ دیکھ سکتا ہو۔

سینٹرل ہیٹنگ ہونے کے باوجود میرا بدن سردی سے کانپ رہا تھا اور میں خود کو ایسا کرنے سے روکنے میں ناکام تھا۔ ایک اذیت ناک بے چینی جسم و جاں پر حاوی ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے بے تابی سے سرپٹخا اور تکیہ کھینچا میرے ہاتھ میں تکیہ تو نہ آسکا البتہ وہ گلابی پھول دار کیچر ضرور آ گیا۔ میری تکلیف میں کچھ اور اضافہ ہوا تھا۔ میرے کانوں میں اس کی گھٹی گھٹی سسکیاں گونجنے لگیں۔ میں نے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ کر آوازیں روکنے کی کوشش کی مگر آواز باہر سے آ رہی ہوتی تو شاید رک جاتی یہ تو میرے اندر سے اٹھ رہی تھی۔ میرے اندر کوئی بہت زور سے مجھ پر ہنسا تھا۔

''سلجوق لغاری ایم بی اے فرام ہارورڈ۔''

''خود پرست اور خود غرض انسان! میل شاؤنزم کا شکار نفسیاتی مریض، بریلنٹ اسٹوڈنٹ، ماں باپ کی واحد اولاد، لغاری گروپ آف انڈسٹریز اور لغاری ایسوسی ایٹس اینڈ کنسلٹنٹس کا اکلوتا وارث اور مجسم غرور۔''

میں بے بسی سے آنکھوں سے نکلتے پانی کو محسوس کر رہا تھا مگر اسے روکنے میں ناکام تھا۔

''کتنا ہنسے تھے نا تم اس کی بے بسی پر اب خود پر ہنسو۔'' کوئی میرا اندر چلایا تھا۔

میری بے بسی اور اذیت ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھی۔

☆☆☆

مظہر بخاری کچھ پریشان تھے۔ ربیعہ صبح سے آئی ہوئی تھی۔ دس منٹ ان کے پاس بیٹھنے کے بعد وہ اب تک اپنے کمرے میں بند تھی۔ اس نے مظہر بخاری کو بتایا کہ سلجوق کو دو دن کے لیے آؤٹ آف سٹی جانا تھا کسی ضروری کام سے، اس لیے وہ ادھر چلی آئی۔ وہ مطمئن تو ہو گئے تھے مگر یہ پریشانی انہیں بہر حال تھی کہ سلجوق انہیں ملے بغیر ہی چلا گیا اور ایسا ضروری کام کیا تھا کہ وہ اپنی نو بیاہتا بیوی کو ساتھ لے کر نہ گیا۔

شام کے کھانے تک وہ نہا دھو کر فریش ہو کر آ گئی، کھانا اس نے ہمیشہ کی طرح ہنستے

مسکراتے خوشگوار ماحول میں کھایا تھا۔ مظہر اس سے سلجوق کے بارے میں پوچھتے رہے کہ وہ اس کے ساتھ کیسا ہے؟ اس کا رویہ ٹھیک ہے؟ ربیعہ خوش ہے؟ وہ انہیں بڑے سلیقے سے مطمئن کرتی رہی۔ وہ ہو بھی گئے تھے۔

اگلا دن بھی بہت خوشگوار تھا۔ وہ آہستہ آہستہ صحت یاب ہو رہے تھے۔ ربیعہ کافی دیر ان کے پاس بیٹھی، ان کے پسندیدہ موضوعات پر گفتگو کرتی رہی پھر انہیں میڈیسن دینے کے بعد ان کو لٹایا اور لائٹ آف کر کے باہر آ گئی۔

کچھ دیر بعد دروازہ بجا کر موحد اندر چلا آیا۔

''ربیعہ! کیسی ہو؟''

''فائن، آؤ بیٹھو۔'' وہ ایزل کے سامنے سے ہٹ گئی۔

''کیا کر رہی ہو؟''

''کچھ نہیں، ربیعہ نے کندھے اچکائے۔

''یہ.....تصویر.....تم نے بنائی۔'' موحد نے دلچسپی سے ایزل پر نظر دوڑائی۔

''ہاں.....دل چاہ رہا تھا۔'' وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

موحد نے پینٹنگ پر نظریں جما دیں۔ وسیع و عریض صحرا اور اس میں چمکتی ہوئی سنہری ریت صحرا پر پھیلی سیاہ رات اور چمکتا چاند خوبصورت تھا۔ صحرا کی ریت پر گھٹنوں کے بل جھکی ہوئی لڑکی جس نے دونوں ہاتھ دعا کے انداز میں اوپر اٹھائے ہوئے تھے۔ موحد اس شاہکار کو دیکھ کر دنگ رہ گیا تھا۔

''چاند تمہاری ہتھیلیوں پر اتر آیا ہے ربیعہ۔'' وہ جھلملاتی آنکھوں سے بولا۔

''میں سمجھی نہیں۔'' وہ حیران ہوئی۔

''سلجوق آیا تھا میرے پاس۔ بیمار ہے وہ، حالت بہت خراب تھی اس کی۔ تم سے ملنا چاہتا ہے، ٹیمز کے کنارے شام سات بجے۔ فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے ربیعہ، میں تمہیں کوئی مشورہ نہیں دوں گا۔ دل سے سوچو اور پھر فیصلہ کرو، چلتا ہوں۔'' وہ خاموشی سے مڑ گیا۔

ربیعہ ساکت و صامت وہیں کھڑی تھی۔

☆☆☆

میں اس وقت دریائے ٹیمز کے کنارے ایک اسٹیمر ریسٹورنٹ میں موجود تھا۔ دریائی

لہروں پر رواں اس ریسٹورنٹ کا ماحول بے حد خوبصورت اور رومینٹک تھا۔ اسٹیمر کے عرشے پر میوزیکل بینڈ نغمہ سرا تھا اور اس کے ساتھ ہی ڈانس فلور تھا۔ جس پر کئی جوڑے محو رقص تھے۔

اور پھر وہ آ گئی۔ سفید شرٹ اور پنک لانگ اسکرٹ میں شانوں پر سفید اسکارف ڈالے، کھلے بال جو کہ اس کے چہرے کا احاطہ کیے ہوئے تھے۔ مجھے وہ بے پنا خوبصورت لگی۔ اس نے مجھے دیکھا اور خاموشی سے میری ٹیبل پر آ گئی۔ چند لمحے خاموشی سے گزر گئے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس لڑکی کو کیا کہوں جس نے صرف دو دنوں میں میرے اندر موجود حسد، نفرت اور غرور جیسی آلائشیوں کو یوں دور کر دیا تھا جیسے وہ کبھی مجھ میں موجود ہی نہ تھیں، میں نے آہستگی سے اس کا ہاتھ تھاما۔ اس کے ہاتھ بہت چھوٹے، نرم اور خوب صورت تھے، مزاحمت کے عمل کے دوران ان ہاتھوں کی ساری نرمی میری کھردری ہتھیلیوں پر اتر آئی تھی۔ اسے لیے ہوئے ڈانسنگ فلور پر چلا آیا۔ اس نے نظریں اٹھا کر مجھے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں اتنا درد ٹھہرا ہوا تھا کہ مجھے لگا جیسے میرا دل کسی نے مٹھی میں بھینچ لیا ہو۔ جانے کتنی بار میں ان آنکھوں میں آنسو لانے کا سبب بنا تھا میں نے بے ساختہ جھک کر ان آنکھوں سے نکلتے موتیوں کو انگلیوں پہ چن لیا۔ اس نے اپنا سر میرے شانے پر دھر دیا۔

''آج سے پہلے میں سوچتا تھا کہ ''جو لوگ ہمارا غرور توڑتے ہیں وہ ہمارے حریف ہوتے ہیں'' مگر اب سوچتا ہوں۔ ''جو ہماری زندگی میں روشنی بن کر بکھر جاتے ہیں وہ ہمارے دوست ہوتے ہیں۔''

''تم میری دوست ہو ربیعہ۔''

''اور تم میری ''متاع حیات'' ہو سلجوق'' ربیعہ کی سرگوشی خوشبو کی مانند میرے گرد بکھر گئی۔

قافلے راہ بھول جاتے ہیں

''اربیحہ! کدھر ہو بھئی؟''

وہ جورٹا مارنے میں مگن تھی۔ یک دم چونکی۔

''جی لالہ!'' اس نے کتاب ایک طرف پھینکی اور تیزی سے باہر بھاگی۔ طویل راہداری عبور کرتے ہی اسے منصور مل گیا۔

''کدھر ہیں سب؟'' وہ خاصا جھنجلایا ہوا لگ رہا تھا۔

''آپ کو کوئی کام ہے تو مجھے بتائیں۔''

''اچھا! پھر کھانا لگاؤ۔ فیصل آیا ہے۔ مجھے آواز دے دینا۔'' وہ حکم جاری کرتا واپس مڑ گیا۔

اربیحہ طویل سانس لیتی کچن کی طرف مڑ گئی۔ کچھ دیر بعد اس نے کھانا لگایا اور ڈرائنگ روم کے دروازے کے قریب آ کر ہلکے سے پکاری۔

''لالہ! میں نے کھانا لگا دیا ہے۔''

''ٹھیک ہے تم جاؤ۔'' منصور کی بھاری آواز ابھری۔

وہ شکر ادا کرتی واپس آ گئی مگر پڑھنے کا سارا موڈ غارت ہو چکا تھا۔ بی اے میں نیا نیا ایڈمیشن لیا تھا اگرچہ کالج ان کے علاقے سے پون گھنٹے کی ڈرائیو پر تھا اور اس کے مزید پڑھنے پر ''ملک ہاؤس'' میں کوئی اتنا خاص آمادہ بھی نہیں تھا مگر بھلا ہو منصور لالہ کا جو سب کے سامنے ڈٹ گئے تھے۔

اس نے طویل سانس لے کر کتابیں بند کیں۔ رائٹنگ ٹیبل سیٹ کی۔ الماری سے اپنا شب خوابی کا لباس نکال کر واش روم کی طرف بڑھ گئی۔ لباس تبدیل کرنے کے بعد اس نے بالوں میں برش کیا اور لائٹ آف کرنے کے لیے آگے بڑھی اور پھر ہر بار کی طرح اس بار بھی اس کی نظر داہنی دیوار پر لگی اس پینٹنگ پر ٹھہر سی گئی۔ اس تصویر میں منظر کشی بہت عجیب سی تھی، ماحول کسی قدر پراسرار اور ایک بے نام سا خوف! اربیجہ کی نظر جب بھی اس پر پڑتی تھی وہ ایک سرد لہر سی خود میں دوڑتی محسوس کرتی۔

اسے یاد تھا کہ جب گھر کو نئے سرے سے سیٹ کیا گیا تھا تو یہ پینٹنگ کہیں سے تحفتاً آئی تھی۔

شومئی قسمت کہ وہ اربیجہ کے کمرے میں سجادی گئی۔

''تصویر میں وسیع و عریض صحرا دکھایا گیا تھا جس پر کالی سیاہ رات نے اپنا بسیرا کر رکھا تھا، چاند پوری آب و تاب سے روشن تھا اور چاندنی میں صحرا کی ریت چمک رہی تھی۔ چمکتی ہوئی اس ریت کے میدان کے عین وسط میں ایک گھڑ سوار تھا جو اپنے گھوڑے کو ایڑھ لگا رہا تھا، گھوڑے کے اگلے پیر اوپر کو اٹھے ہوئے تھے، گھڑ سوار کا لباس بھی سیاہ تھا اور مستزاد اس نے اپنا چہرہ بھی سیاہ ڈھاٹے سے ڈھکا ہوا تھا جو کہ تصویر کی کشش اور خوف میں اضافے کا سبب بن رہا تھا۔ بہت مدھم سے الفاظ میں نیچے

''Going to revange'' (انتقام کے لیے روانہ) درج تھا۔

اس وقت بھی وہ عجیب سی کیفیات کا شکار ہو کر لائٹ آف کر کے بستر پر آ گئی۔ پتا نہیں وہ گھڑ سوار کون سا بدلہ لینے کہاں جا رہا تھا۔ سوچتے سوچتے وہ کب نیند کی وادی میں اتری اسے خبر ہی نہ ہو سکی۔

☆☆☆

سیاہ تارکول کی سڑک پر برق رفتاری سے دوڑتی ہوئی بی ایم ڈبلیو نے اپنا رخ کچی سڑک کی طرف موڑا تو ٹائر ایک لمحے کو زور سے چرچرائے، پھر انجن غرایا اور گاڑی فراٹے بھرتی ہوئی حویلی کی طرف بڑھنے لگی۔

شام کا دھندلکا ہر سو چھا رہا تھا۔ کچے رستے دورویہ لگے بڑے بڑے سفید اور شیشم کے درخت خاموش اور ساکت کھڑے تھے۔ ماحول اس وقت صرف پرندوں کے شور سے گونج

رہا تھا۔ سائے لمبے ہوتے ہوئے بتدریج سمٹ رہے تھے۔ آخر کار گاڑی سرخ و سیاہ امتزاج سے مزین ماربل سے بنی حویلی کے سامنے رک گئی۔ چوکیداروں نے تیزی سے گیٹ کے پٹ وا کیے۔ گاڑی سیاہ بجری کی روش پر چلتی ہوئی پورٹیکو کی طرف بڑھ گئی۔ نثار نے تیزی سے بڑھ کر دروازہ کھولا۔

''سلام شاہ سائیں!'' اس نے ادب سے سلام کیا۔

سیاہ شلوار قمیض میں ملبوس کندھوں پر اجرک اوڑھے ''شاہ فضل'' نے جواباً صرف سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ اس کے قدم تیزی سے مردان خانے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ نثار کے قدم اس کا ساتھ دینے کی کوشش میں ہانپ رہے تھے۔

''حویلی میں سب خیریت ہے؟'' اس نے اپنے مخصوص بارعب اور گرجدار لہجے میں پوچھا۔

''جی سائیں! سب خیریت ہے۔''

''شاہ فیصل کدھر ہے؟'' اس نے اگلا سوال داغا۔

نثار ایک لمحے کو گڑبڑایا۔

''وہ ..... وہ سائیں! اپنے دوست ملک سے ملنے گئے ہیں۔'' اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

شاہ فضل کے برق رفتار قدم تھم گئے۔ اس کی پیشانی پر شکن آ گئی۔

''تم نے اسے میرے آنے کے بارے میں نہیں بتایا؟''

''جی سائیں! نثار نے نظریں جھکا لیں۔

''میرا پیغام دیا تھا؟''

''جی سائیں!''

''ٹھیک ہے تم جاؤ۔'' اس نے طویل سانس لے کر قدم زنان خانے کی طرف موڑ دیے۔

نثار جان چھوٹنے پر شکر ادا کرتا واپس مڑ گیا۔

بی بی جان کے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے اس نے جیب سے موبائل نکال کر شاہ فیصل کا نمبر ملایا تھا۔ دوسری بیل پر فون اٹھا لیا گیا۔

''ہاں سائیں! کدھر ہو؟ ہم تو تمہارا انتظار کر رہے تھے حویلی میں، پتا چلا، تمہارے

لیے اپنے ویر (بھائی) سے اہم اپنے سجن ہیں اسی لیے تو ایک ماہ بعد ملنے کی بے تابی صرف اپنے متروں (دوستوں) سے تھی، ہم سے نہیں۔'' اس کے تحکم بھرے لہجے میں طنز کی آمیزش صاف نظر آتی تھی۔

''نہ.....نہ.....سائیں!''

''اب کیا فائدہ؟ ثبوت تو تم نے دے دیا کہ تمہارے لیے کون ''اہم'' ہیں؟'' اس نے تلخ لہجے میں ''اہم'' پر زور دیا۔

''ہم سب سمجھتے ہیں رشتوں اور دوستوں کا مقام۔ تم ہمیں مت سکھاؤ۔ تم حویلی آجاؤ۔ باقی بات پھر کریں گے۔'' اس نے فون بند کر دیا۔

اس کی چمک دار سیاہ آنکھیں سلگ رہی تھیں۔

''اس کے بار ہا سرزنش کرنے کے باوجود بھی شاہ فیصل اور منصور ملک کی دوستی بڑھتی گئی تھی۔ ملک خاندان سے ان کے تعلقات کچھ خاص بہتر نہ تھے مگر کوئی دشمنی بھی نہیں تھی محض ایک لاتعلقی تھی جو بری طرح دونوں خاندانوں کے درمیان حائل تھی۔ شاہ فیصل اور منصور ملک کی بڑھتی ہوئی دوستی میں اگرچہ کسی کو کوئی نقصان نظر نہ آتا تھا مگر شاہ فیصل کی بات رد کرنے کی ہمت کس میں تھی؟ اس نے صاف لفظوں میں شاہ فیصل کو منصور ملک سے تعلقات ختم کرنے کو کہا تھا مگر شاہ فیصل نے صریحاً اسے نظر انداز کر کے اپنی ''حکم عدولی'' کی سزا کو گویا مزید سخت کر دیا تھا۔

بی بی جان کے کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے اس کے جبڑے بھینچے ہوئے تھے اور ہونٹ سختی سے آپس میں پیوست تھے۔

☆☆☆

تاحد نظر پھیلے مالٹے اور سیب کے باغات کے درمیان کچے رستے پر تیزی سے دوڑتی گھوڑا گاڑی میں سے ایک ذی نفس چھلانگ لگا کر باہر نکلا۔ ادھر ادھر دیکھا اور سیدھا مالٹے کے درختوں کے جھنڈ میں گھستا چلا گیا۔ اس کے آشنا انداز اسے یہاں کا رہائشی ظاہر کرتے تھے۔ وہ درختوں کے درمیان جگہ بناتا تیزی سے آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ ایک طرف رک کر اس نے چوکنا انداز میں چاروں طرف دیکھا۔ جیب میں کسی چیز کی موجودگی کا یقین کیا اور اپنے لیے ایک مناسب مورچہ تلاش کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد اس کی نگاہیں ایک قدرے نیچے کو جھکے اور پھیلے ہوئے

درخت پر جا کر رک گئیں۔ اسے یقین تھا وہ دونوں یہیں آئیں گے۔

اس نے اپنی پوزیشن سیٹ کی اور عقابی نگاہ سے چاروں طرف کا جائزہ لیا، پھر اپنے کان کچے رستے کی طرف لگا دیے جہاں سے جیپ کی آواز قریب آتی محسوس ہو رہی تھی۔ جوں جوں آواز قریب آتی جا رہی تھی، اس کے اعصاب مزید تنے جا رہے تھے۔ دل کی دھڑکن بھی بڑھی ہوئی سی لگ رہی تھی اور آخر کار وہ جیپ اس کے قریب سے گزر کر قدرے آگے جا کر ترچھی ہوئی اور پھر رک گئی۔

☆☆☆

''منصور! یار کدھر ہو تم؟''

''شاہ سائیں! میں اپنے گیٹ پر پلکیں بچھائے آپ کا منتظر ہوں۔'' منصور نے چھبتے ہوئے لہجے میں طنز کیا۔

جواباً فیصل نے ایک بلند و بانگ قہقہہ لگایا۔

''فکر مت کرو بابا! ہم تمہاری طرف آ رہے ہیں بلکہ جلوہ افروز ہو رہے ہیں۔ ہم اپنی رعایا کی صدا خالی نہیں جانے دیتے بابا'' فیصل نے ہنسی روکتے ہوئے خالص وڈیرے کے سے انداز میں کہا۔

''مہربانی سائیں! آپ تشریف کا ٹوکرا لے ہی آئیں ورنہ.....'' منصور نے دھمکاتے ہوئے فون بند کیا۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔

دونوں کا آج شام شکار کا پروگرام تھا۔ فیصل کو اسے پک کرنا تھا، جب ہی منصور پچھلے آدھے گھنٹے سے انتظار کر رہا تھا، مگر فیصل کا دور دور تک کوئی نشان نہیں تھا۔ کئی بار تو اس کا دل چاہا کہ وہ اپنی گاڑی لے کر نکل جائے، پھر کچھ سوچ کر رک گیا۔ اسی کشمکش کے دوران فیصل کی کال آ گئی۔ کچھ دیر بعد گیٹ پر جیپ کی آواز سنائی دی، وہ تیزی سے باہر کی طرف بڑھا۔ فیصل دروازہ کھول کر نیچے اتر چکا تھا۔ منصور بڑھ کر اس سے بغل گیر ہو گیا، پھر مسکراتے ہوئے پیچھے ہٹا۔

''خیریت! آج بڑی خوشبوئیں اٹھ رہی ہیں جناب سے۔''

''کچھ نہیں یار! ایسے ہی دل چاہا تھا۔'' فیصل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے، بھئی دل ہے، کبھی بھی چاہ سکتا ہے اور کچھ بھی چاہ سکتا ہے۔ اب چلیں؟'' منصور نے کہا۔

دونوں جیپ کی طرف بڑھ گئے۔ ان کی جیپ تیزی سے کچے رستے پر دھول اڑاتی سیبوں اور مالٹوں کے درختوں کو چیرتی آگے بڑھ رہی تھی۔

تب ہی نہ جانے کیا ہوا۔ جیپ ایک جھٹکے سے رک گئی۔

فیصل نے اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی، پھر دروازے کھول کر دونوں نیچے اتر آئے۔

فیصل جیپ کا بونٹ کھول کر دیکھنے لگا۔ تب ہی گولی چلنے کی آواز پر منصور نے چونک کر دیکھا۔ اردگرد کوئی نظر نہیں آیا تو اس نے اپنا روسی ساختہ بریٹا نکال لیا اور فائر کیا لیکن گولی نہیں چلی۔

''مجھے لگتا ہے، اس کے ٹرائیگر میں کوئی مسئلہ ہے۔'' منصور نے ریوالور کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''ابھی چیک کر لیتے ہیں'' فیصل اس کے ہاتھ سے ریوالور لے کر دیکھنے لگا۔

''اب اسے چلا کر دیکھو۔'' منصور نے آسمان کی طرف اس کا رخ کر کے ٹرائیگر دبایا۔ مگر بے سود۔ منصور ریوالور دیکھ رہا تھا اور پھر پتا نہیں کیا ہوا فضا ایک دم فائر کی آواز سے گونجی۔ فیصل کے جسم کو ایک جھٹکا سا لگا، اس کے سینے سے خون کا فوارہ سا پھوٹا تھا۔ منصور نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گیا۔ فیصل کا وجود لرزا اور پھر پوری قوت سے کچے میں جا گرا اور ساکت ہو گیا۔ اس کا جان دار وجود پل دو پل میں خاک کے ڈھیر میں مل گیا تھا۔

درختوں پر پھڑ پھڑاتے پرندے زور و شور سے چیخ رہے تھے۔ منصور پھٹی پھٹی نگاہوں سے فیصل کو دیکھ رہا تھا جس کی ساکت آنکھوں میں حیرت گویا جم کر رہ گئی تھی۔ خوف نے پوری شدت سے اس پر حملہ کیا۔

''میں نے..... میں نے..... نہیں مارا.....؟ وہ پلٹ کر پوری طاقت اور وحشت سے بھاگا تھا۔

سیبوں اور مالٹوں کے درختوں کے عین وسط میں کھڑی جیپ اور اس کے ساتھ پڑی فیصل کی لاش کے بالکل ساتھ وہ ریوالور گرا پڑا تھا جس پر منصور کی انگلیوں کے نشان بہت واضح تھے۔ فضا میں مالٹوں کی خوشبو کے ساتھ ایک بو بھی پھیل رہی تھی اور وہ تھی موت کی بو، جو کہ فیصل کے خوشبودار وجود سے اٹھ رہی تھی۔

☆☆☆

شاہ محمود کے دو بیٹے تھے۔ ''شاہ فضل'' اور ''شاہ فیصل''۔ ان کا شمار گاؤں کے وڈیروں میں کیا جاتا تھا۔ شاہ محمود پنچایت کے پنچ تھے اور اپنی انصاف پسندی کی بنا پر پورے گاؤں میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ ان کی اپنی زمینیں اور باغات تھے۔ لاہور میں تین فیکٹریاں چل رہی تھی۔ ''شاہ فضل'' نے ایگری کلچر میں ماسٹرز کیا تھا۔ اس کی ذات کی سب سے نمایاں شناخت تھی، اس کا غرور تھا۔

چلتا تو یوں جیسے سلطنت فتح کر لے گا۔ بولتا تو یوں جیسے اس کے سامنے اس کی حقیر ترین رعایا کھڑی ہو۔ دیکھتا تو یوں جیسے آنکھوں سے روح کھینچ لے گا۔ اس کی شخصیت کو اگر دو لفظوں میں بیان کیا جا سکتا تو شاید یہ تھا۔ ''مجسم غرور۔'' اس کا غصہ اتنا سخت اور تیز تھا کہ بعض دفعہ تو شاہ محمود بھی گھبرا جاتے تھے۔

اس کے بعد ''شاہ فیصل'' تھا۔ ایم بی اے پارٹ ون کا اسٹوڈنٹ، بلا کا شریر، بذلہ سنج اور زندہ دل۔ اکڑ تو جیسے اسے چھو کر نہیں گزری تھی۔ صحیح معنوں میں وہ ''شاہ فضل'' کی الٹ تھا۔

''فیروز ملک'' کا شمار بھی علاقے کی بااثر شخصیات میں کیا جاتا تھا مگر وہ گاؤں کے اندرونی معاملات سے ہمیشہ لاتعلق اور بے خبر رہے تھے ان کے دو ہی بچے تھے ''منصور ملک'' اور ''اریبہ ملک'' تھے منصور ان کے ساتھ لاہور والی فیکٹری میں ہوتا تھا جبکہ اریبہ نے بی اے میں نیا نیا ایڈمیشن لیا تھا۔ انیس سالہ اریبہ میں جیسے منصور کی جان تھی۔ وہ بہن سے بے تحاشا پیار کرتا تھا اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ تھا کہ اس نے سب سے باقاعدہ ٹکر لے کر اسے آگے ایڈمیشن دلوایا تھا، گھر میں کوئی راضی نہ تھا۔ ان کی فیملی میں لڑکیوں کو اتنا آگے پڑھانے کا رواج ہی نہیں تھا مگر منصور سب کے آگے ڈٹ گیا تھا اور یوں اس وقت وہ تھرڈ ایئر کی اسٹوڈنٹ تھی۔

☆☆☆

پورے علاقے میں ایک طوفان سا آیا ہوا تھا اور وہ تھا ''شاہ فیصل'' کی موت کا طوفان، جس نے حویلی کی بنیادیں ہلا ڈالی تھیں، شاہ فضل تو بپھرا شیر بنا ہوا تھا اس کا بس چلتا تو منصور ملک سمیت اس کے پورے خاندان کو آگ لگا ڈالتا مگر یہ شاہ محمود کی کمال قوت برداشت تھی، جس نے ابھی تک اس کے ضبط کا پیمانہ لبریز نہ ہونے دیا تھا۔ آج شاہ فیصل کی موت کو تیسرا دن تھا۔ پنچایت بیٹھ چکی تھی۔ تمام ثبوت اور گواہیاں منصور ملک کے خلاف تھیں۔ یقیناً وہ سزا کا مستحق ٹھہرتا مگر تب..... جب وہ موجود ہوتا۔ وہ اسی دن اسی وقت فرار ہو چکا تھا۔ تا حال

اس کا نام ونشان نہیں ملا تھا۔ ''شاہ فضل'' کے آدمی پاگل کتوں کی مانند ہر طرف اس کی بو سونگھتے پھر رہے تھے مگر وہ ہنوز لاپتہ تھا۔ ایک اندازہ یہ بھی لگایا جا رہا تھا کہ لازماً وہ علاقہ غیر کی طرف نکل گیا تھا۔

حویلی کے مردان خانے میں اس وقت گرما گرم بحث چھڑ ہوئی تھی۔ تمام سرکردہ افراد موجود تھے پنچائیت کا فیصلہ سنایا جا چکا تھا۔

''یہ ناممکن ہے بابا سائیں!'' شاہ فضل کی دھاڑ گونجی تھی۔

''خون کو ٹھنڈا رکھو سائیں! یہ فیصلہ ہو چکا ہے اور یاد رکھو، ایسے کتنے ہی معاملات کے فیصلے ہم نے بھی ایسے ہی سنائے تھے۔'' بابا سائیں کا لہجہ پرسکون تھا۔

''آپ کا مطلب ہے، میں اپنے بھائی کے خون کی قیمت لے لوں۔ بے غیرت بن جاؤں؟'' وہ پاگل ہونے کو تھا۔

''دوسرا راستہ زیادہ بہتر ہے، تم فیروز ملک کی بیٹی سے نکاح کر لو۔'' اس کے چچا شاہ فرقان نے کہا۔

''دیکھو فضل بیٹا! مجرم فرار ہو چکا ہے۔ اس لیے فیصلہ یہی کیا گیا کہ خون بہا کی رقم یا لڑکی۔ آگے جو تم مناسب سمجھو۔'' اس بار اسے سمجھانے والے ماموں فراز تھے۔

''میرے فیصل کا خون اتنا ارزاں نہیں کہ میں اس کی قیمت لوں؟'' وہ غرایا تھا۔ آنکھوں میں پھیلی سرخی اس کے رت جگوں اور غضب کی غماز تھی۔

''ہاں..... لڑکی پر سمجھوتہ ہو سکتا ہے'' وہ لب بھینچتے ہوئے بولا۔

سب نے ایک نامعلوم سی تسکین بھری سانس لی۔ تاہم اب ایک نئی بحث چھڑ چکی تھی۔

دوسری طرف ''ملک ہاؤس'' پر بھی ایک قیامت ٹوٹی ہوئی تھی۔ فیروز ملک کے کندھے جھکے ہوئے تھے وہ پنچائیت کا فیصلہ سن کر سکتے میں آ گئے تھے مگر جانے کیوں انہیں یقین تھا کہ وہ رقم کا مطالبہ ہرگز نہیں کریں گے۔ وہ شاہ محمود کے خاندان کو جانتے تھے۔ ان کی غیرت کا تقاضا یہی تھا کہ وہ رقم قطعاً قبول نہ کریں۔ ویسے بھی ان کے پاس دولت کی کمی نہ تھی جیسے ہی فیروز ملک دوسری طرف سوچتے ان کے دل کی نازک رگیں ٹوٹنے لگتیں۔ کیونکہ اس طرف ان کی اکلوتی نازوں پلی بیٹی اربیحہ تھی ''ملک ہاؤس'' میں داخل ہو کر انہوں نے کس حوصلے سے سب کو پنچائیت کا فیصلہ سنایا تھا مگر پھر جیسے ضبط کی حد ختم ہو گئی تھی۔ وہ ڈھے سے گئے اور فرزانہ ملک تو

جیسے ساکت سی ہو چکی تھیں۔

''میری بچی کا کیا قصور ہے ملک صاحب؟'' وہ روتے ہوئے پوچھ رہی تھیں۔

فیروز نہ چاہتے ہوئے بھی نظریں چرا گئے۔ اگلی صبح ان کے شکوک صحیح ثابت ہو گئے تھے۔ حویلی سے فیصلہ آ چکا تھا۔

اسی شام اربیحہ کو شاہ فضل کے نکاح میں دے دیا گیا۔ اربیحہ نے چھوٹے سے بیگ میں اپنے چار جوڑے رکھے۔ ایک ساکت اور ضبط سے بھری نگاہ اپنی کتابوں پر ڈالی تھی۔ جن میں سے کچھ پر تو اس نے ابھی اپنا نام تک نہ لکھا تھا، پھر اس کی نظر دیوار پر لگی اس تصویر پر پڑی۔ اس نے اسے دیوار سے اتارا اور اپنے بیگ میں رکھ لیا تھا۔

رخصت کرتے ہوئے اس کی ماں نے کہا تھا کہ وہ سمجھ لے، اس نے اپنی زندگی بھائی کے اوپر صدقہ کر دی۔

☆☆☆

آج اسے حویلی میں آئے دوسرا دن تھا۔ اس نے ابھی تک شاہ فضل کو نہیں دیکھا تھا۔

آج ملازمین کی پھرتیاں اور حویلی میں ہونے والی ہلچل بتا رہی تھی کہ وہ واپس آ رہا تھا۔

حویلی میں سب کا رویہ اس کے ساتھ اچھا نہیں تھا تو بہت برا بھی نہیں تھا۔ بی بی جان نے اس سے مختصر سی بات کی تھی اور اسے کمرے میں جانے کو کہا تھا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد جب شام کی تیاری ہونے لگی تو وہ خاموشی سے بی بی جان کے پاس آ بیٹھی جو زیر لب تسبیح پر کچھ پڑھ رہی تھیں۔

''فضل پہنچ چکا ہے۔'' انہوں نے اسے بتایا۔

ایک نامعلوم سرد لہر اس کے اندر دوڑ گئی۔ پتا نہیں وہ کتنا غصیلا اور تند خو تھا، شاید اتنا جتنا اس نے سب سے سنا تھا یا شاید اس سے بھی زیادہ۔ وہ جان گئی تھی کہ وہ شاہ فیصل سے بے حد پیار کرتا تھا جان چھڑکتا تھا اس پر اور اب کیا کرے گا وہ اس کے ساتھ؟

''تم کچن میں جا کر دیکھو، کھانا تیار ہے'' بی بی جان نے اسے اس کی سوچوں سے نکالا۔

وہ سر جھٹک کر اٹھی اور کچن کی طرف بڑھ گئی۔ سب انتظام دیکھ کر واپس آتے ہوئے وہ یکدم رک سی گئی۔ اندر سے باتوں کی آواز آ رہی تھی۔ بی بی جان کی آواز کے ساتھ ایک مردانہ آواز، جو یقیناً شاہ فضل کی تھی۔ بھاری، بارعب، پر تاثر، اربیحہ کو اپنا دل کنپٹیوں

میں دھڑکتا محسوس ہوا۔

وہ تیزی سے واپس مڑ گئی۔ بھاگتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف آ کر اس نے اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا تھا۔

پھر ملازمہ اسے کھانا دینے آئی، مگر اس نے انکار کر دیا، اس کی بھوک پیاس یک لخت ختم ہو چکی تھی۔

شام کے تھال میں رات کے سکے گرنے لگے۔ آوازیں بتدریج مدھم ہوتی گئیں اور روشنیاں گل۔ جب ہلکی سی دستک کی آواز پر وہ اچھل پڑی۔ بڑھ کر دروازہ کھولا تو ندرت کھڑی تھی۔

''چھوٹی بی بی! آپ کو شاہ سائیں نے بلایا ہے۔'' اربیحہ نے ہراساں ہو کر اس کی شکل دیکھی۔

''کہاں بلایا ہے؟'' اس نے بے ساختہ پوچھا۔

''اپنے کمرے میں۔ آئیں میں آپ کو چھوڑ آؤں۔'' اربیحہ نے لرزتے ہاتھوں کے ساتھ بمشکل اپنی گرم شال کو اپنے گرد لپیٹا اور اس کے ساتھ چل پڑی۔

ندرت اسے مردان خانے میں لے آئی۔ پھر ایک منقش دروازے کے سامنے رک گئی۔ ہلکا سا بجایا اور دھیمی مودب آواز میں بولی۔

''سائیں! میں چھوٹی بی بی کے ساتھ ہوں۔''

''آ جاؤ۔'' اس کی بھاری، گھمبیر آواز گونجی۔

ندرت نے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گئی۔ اربیحہ اس کے پیچھے تھی۔ کمرہ کیا تھا پورا شیش محل تھا۔ اتنا خوبصورت، اتنا ویل فرنشڈ۔ اربیحہ دنگ سی تھی۔

''کوئی خدمت سائیں؟'' ندرت نے پوچھا۔

''نہیں، تم جاؤ'' اس نے حکم دیا۔

ندرت خاموش سے مڑ گئی۔ کمرے کا دروازہ کھلا اور پھر بند ہو گیا۔

اربیحہ بمشکل لرزتی ٹانگوں کا بوجھ سنبھالے نظریں زمین پر گاڑے کھڑی تھی۔ اسے لگ رہا تھا وہ ابھی گر جائے گی۔

سرخ شنیل کے لحاف میں نیم دراز وہ بڑے سکون سے اس کے چہرے کے اڑتے رنگوں کو ملاحظہ کر رہا تھا۔ سیاہ گرم شال اور سرخ پلین لینن کے سوٹ میں وہ دمک رہی تھی۔ اس کی

گھور سیاہ آنکھوں میں وحشت اور خوف تھا۔ چہرے سے وہ اپنی عمر سے بہت کم لگ رہی تھی۔ شاہ فضل کی نجانے کون سی حس کو تسکین پہنچی تھی۔ اس کی نظریں اربیحہ کے سراپے پر جم کر رہ گئی تھیں اور نظروں کی تپش سے وہ کچھ اور زرد ہو گئی تھی۔

''کیا نام ہے تمہارا؟'' اس کی سرد آواز گونجی۔

''اربیحہ۔'' وہ بمشکل حلق سے آواز نکال کو بولی۔

''کیا کرتی ہو؟'' اگلا سوال ہوا۔ اربیحہ کو لگا وہ کسی تفتیشی افسر کے سامنے کھڑی ہو۔

''پڑھتی ہوں۔'' اس نے کہا پھر یکلخت اپنے غلط جواب کا ادراک ہوا۔ ''پڑھتی تھی'' اس نے فوراً کہا۔

شاہ فضل نے قدرے دلچسپی سے اسے دیکھا ''کیا پڑھتی تھیں؟''

''بی اے میں ایڈمیشن لیا تھا۔'' اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ حلق میں جیسے کانٹے اگ آئے تھے۔

''کب؟''

''ایک ماہ پہلے۔'' اس کی ٹانگیں تھک چکی تھیں۔ اس کا دل چاہا کاش وہ وہاں سے بھاگ سکتی۔

''ماں باپ تو تمہارے بڑے خود غرض نکلے۔ بیٹے کے بدلے تمہیں پیش کر دیا۔'' اس نے حقارت سے کہا۔

اربیحہ کے سینے میں ایک انی سی گڑ گئی۔ اس کا دل چاہا وہ دھاڑیں مار مار کر روئے۔ وہ خاموش کھڑی آنسو پینے کی کوشش کرتی رہی۔

''یہاں آؤ'' اس نے حکم دیا۔

اربیحہ کے قدموں سے زمین سرکی تھی۔ اس نے بے اختیار سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ اس کے سامنے تھا۔ اپنی پوری شان و شوکت اور جاہ و جلال کے ساتھ۔ سیاہ شلوار سوٹ میں آستینیں کہنیوں تک موڑے، ٹانگوں پر لحاف ڈالے، چمک دار سیاہ آنکھیں اور کھڑی ناک، گھنی مونچھوں تلے عنابی لب باہم بھینچے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھوں نے جیسے اسے ہپناٹائز کر دیا تھا۔ وہ کسی ٹرانس کی سی کیفیت میں چلتی بیڈ کی طرف بڑھنے لگی۔

''اتنا تو تم جانتی ہو گی کہ خون بہا میں آنے والی عورتوں کو کیا حیثیت دی جاتی ہے؟''

اس نے سفاکی سے کہا۔

''جی نہیں۔'' اس نے ہمت کر کے کہا۔

''جان جاؤ گی۔'' وہ تلخی سے ہنسا تھا۔

''مجھے نہیں پتا بی بی جان نے تمہیں اس حویلی میں کیا حیثیت دی ہے مگر یہاں تمہاری حیثیت وہ ہوگی جو میں متعین کروں گا۔'' وہ رعونت سے بولا تھا۔

اربیحہ کا سانس جیسے سینے میں ہی اٹک گیا۔ اس کے ساتھ اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ کمرے میں تاریکی چھا گئی۔ بالکل اس کی قسمت کی طرح..... اندھیرا بڑھنے لگا۔ چادر اتر گئی۔ دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ اربیحہ کا جی چاہ رہا تھا، وہ زور زور سے روئے، ماں کو پکارے، اس کی گھٹی گھٹی سسکیاں اور دبی دبی چیخیں شاہ فضل کو کتنی تسکین پہنچا رہی تھیں، وہ نہیں جانتی تھی وہ وحشی تھا اور اس کی وحشت اور بربریت سہتے ہوئے وہ ادھ موئی سی ہو رہی تھی۔ وہ اس سے اتنی گندی زبان بول رہا تھا کہ اربیحہ کا دل چاہا کاش وہ اپنے کان بند کر سکتی۔ روتے گڑگڑاتے ہوئے اس نے کتنی بار اس سے رحم کی بھیک مانگی تھی۔

''رحم شاہ سائیں..... رحم.....'' وہ مر رہی تھی، جواباً الٹے ہاتھ کا ایک بھرپور طمانچہ اس کے گال پر پڑا تھا۔ اربیحہ نے اپنے منہ میں خون کا ذائقہ گھلتا ہوا محسوس کیا تھا۔

''تیرے بھائی نے کیا تھا؟'' وہ غرایا تھا بالکل کسی بھوکے بھیڑیے کی مانند۔

وہ چیخ اٹھی تھی کہ بات اب برداشت اور ضبط کی حد سے نکل چکی تھی اور اس کی ہذیانی چیخیں سن کر جیسے وہ بھی درندگی پر اتر آیا تھا۔ درد کی آخر حد کو چھوتے ہوئے اس نے کب حواس گنوائے، اسے خبر نہ ہوئی تھی۔

☆☆☆

آؤ جانچ لیتے ہیں
درد کے ترازو پر
کس کا غم کہاں تک ہے؟
شدتیں کہاں تک ہیں
کچھ عزیز لوگوں سے
پوچھنا تو پڑتا ہے

آج کل محبت کی
قیمتیں کہاں تک ہیں؟

اس کی آنکھ پتا نہیں کون سے احساس سے کھلی تھی۔ چند لمحے وہ بے حس و حرکت چھت کو گھورتی رہی، پھر حواس بیدار ہوتے ہی اسے بے پناہ گھٹن کا احساس ہوا تھا۔ اس نے اپنے اردگرد نظر دوڑائی۔ وہ اس کے پاس ہی تو تھا۔ یوں کہ وہ اس کے دائیں بازو اور دائیں ٹانگ کے نیچے دبی ہوئی تھی۔ اس کی سانس مزید رکنے لگی۔ یکلخت رات کے مناظر اس کے ذہن کے پردے پر لہرائے، خوف کی ایک سرد لہر تھی جو اس کو پسینے میں نہلا گئی۔

''یا اللہ! میں زندہ ہوں..... ابھی تک..... کیوں ہوں میں زندہ..... کیا اتنی حقارت..... اتنی ذلت سہنے کا حوصلہ تھا مجھ میں..... کیا میرے اعصاب اتنے مضبوط ہیں؟ یا پھر.....؟ وہ سب جو اس شخص نے میرے ساتھ کیا ہے، کیسے سہہ لیا میں نے؟ وہ سب گالیاں جو اس نے مجھے دی ہیں۔ کیسے سن لیں میں نے؟ میں مر کیوں نہ گئی۔ اتنی وحشت ایسی درندگی کیسے جھیل گئی میں؟ کیا میں اتنی حوصلہ مند ہوں؟'' وہ حیران تھی، بے حد حیران۔

اتنی تذلیل اور ایسی بے بسی!
اتنی سفاکی اور جنون!

اسے اپنے گرد لپٹا اس کا بازو کسی ناگ کی مانند لگا تھا۔ اس کا سرد درد سے پھٹ رہا تھا۔ ہر ہر عضو میں بھر جانے والی اذیت اس کی رگِ جاں کو توڑ رہی تھی۔ کتنے بے آواز آنسو اس کے گالوں سے بہتے۔ بالوں میں جذب ہو رہے تھے۔

سچ کہا تھا شاہ فضل نے۔ حیثیت کا تعین حقیقتاً ہو چکا تھا۔ کیا حیثیت دی گئی تھی اسے؟ شاہ فضل نے ایک رات میں ہی عملاً اپنے رویے سے اسے سمجھا دیا تھا۔

''میرے باہر جنگل تھا
اور میرے اندر آگ
آگ نکالوں
سب جل جائے
آگ چھپالوں
خود جل جاؤں''

☆☆☆

کتنے ڈھیر سارے دن بیت گئے۔ اربیجہ کو یاد نہیں تھا۔ اس نے دنوں کا حساب رکھنا چھوڑ دیا تھا یا شاید اس قید خانے میں وقت کے شمار کا تصور ہی نہ تھا۔ زندگی عین اس انداز میں بسر ہو رہی تھی، جس طرح شاہ فضل چاہتا تھا۔

اس کی حیثیت کا تعین ہونے کے بعد وہ تمام مراعات سے بھی مستثنیٰ قرار دے دی گئی۔ اس وقت وہ بالکل اسی انداز میں رہ رہی تھی جیسے دیگر خادمائیں رہتی تھیں۔ ان سب کی طرح وہ صبح پانچ بجے اٹھ جاتی۔ کچن کا سارا کام اس کے ذمہ تھا۔ وہ برتن صاف کرتی، دودھ ابالتی، آٹا گوندھتی اور بوقت ضرورت سبزی وغیرہ کاٹ لیتی تھی۔ سالن بنانا ندرت کی ذمہ داری تھی۔

اس کے علاوہ شاہ فضل کی ساری ذمہ داری بھی اسی پر تھی۔ وہ ملازماؤں کے ساتھ ہی کھاتی پیتی تھی یا پھر جو شاہ فضل کا بچا کھچا ہوتا۔ بالکل عام بلکہ کسی حد تک بدوضع کپڑے پہن لیتی تھی۔ سارا دن گدھوں کی طرح مشقت کرنے کے بعد اس کے پاس یہ حق بھی نہ تھا کہ وہ دو گھڑی لیٹ کر کمر سیدھی کر سکے۔ اسے رات کے کھانے کے برتن صاف کرنے ہوتے تھے اور اس کے ساتھ کچن بھی صاف کرنا ہوتا تھا۔ سونے کے لیے اسے بہر حال شاہ فضل کے کمرے میں جانا ہوتا تھا۔ یہ شاہ فضل کا حکم تھا جس سے سرتابی کی اسے مجال نہ تھی۔

☆☆☆

''شاہ سائیں! کھانا۔'' اس نے بڑی سی ٹرے ٹیبل پر رکھی اور مدھم آواز میں کہا۔

وہ کمپیوٹر پر کوئی کام کر رہا تھا۔

''جاؤ۔'' اس نے سر اٹھائے بغیر حکم دیا۔

وہ خاموشی سے چلتی باہر آ گئی۔ کچن میں آ کر اس نے وہ ڈھیر سارے برتن دھونے شروع کر دیے جن سے سارا سنک بھرا ہوا تھا۔ مسلسل کام کر کے اس کی کمر دکھ رہی تھی اور ٹانگیں جیسے بے جان ہو رہی تھی مگر وہ بے حس بنی کام میں لگی رہی۔ احساسات جگا کر کرنا ہی کیا تھا۔ زندگی صرف درد و غم سے عبارت رہ گئی تھی۔ بے حسی نے اسے پوری طرح اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا۔ رات کا تیسرا پہر شروع ہو رہا تھا۔

وہ کام ختم کر کے باہر نکلنے کو تھی۔ اس کی نظر شاہ فضل کے کمرے سے واپس لائی گئی ٹرے پر پڑی۔ اس کی پلیٹ میں بچے ہوئے چاول موجود تھے۔ اسے ایک دم احساس ہوا، اس

نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ پیٹ میں جیسے آگ سی لگی ہوئی تھی۔ وہ بے اختیار پلیٹ تھام کر نیچے ٹھنڈے فرش پر بیٹھ گئی۔ اسی وقت قدموں کی چاپ ابھری اور اس کے ساتھ ہی شاہ فضل کی صورت دروازے کے فریم میں دکھائی دی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''حکم سائیں!'' اس نے نظریں جھکا کر کہا، اب زندگی صرف ان ہی دو لفظوں پر محیط کر رہ گئی تھی۔

وہ آگے بڑھ کر کچن میں پڑی ٹیبل کے گرد رکھی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا۔

''بیٹھ جاؤ۔'' اس نے حکم دیا۔ وہ خاموشی سے اس کے پیروں میں بیٹھ گئی۔

''کھانا کھاؤ۔'' اگلا حکم ہوا۔ اربیجہ کے ہاتھ میکانکی انداز میں پلیٹ کی طرف بڑھ گئے مگر جانے کیوں ہر نوالہ حلق میں اٹک رہا تھا۔ آنسوؤں کا گولہ سا حلق میں پھنسا ہوا تھا شاید۔ وہ ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے بڑے کروفر سے یوں بیٹھا تھا کہ اس کا دایاں پاؤں بالکل اربیجہ کے چہرے کے قریب تھا۔ اگر وہ ذرا سی حرکت کرتا تو لازماً اس کا پیر اس کے منہ پر جا لگتا۔ تذلیل کے احساس سے اربیجہ کا چہرہ زرد سا ہو رہا تھا۔ جانے کیوں وہ اس غیر انسانی سلوک کی عادی نہیں ہو پا رہی تھی۔ صرف چند نوالے لینے کے بعد اس نے ہاتھ روک لیا۔ خاموشی سے اٹھی۔ پلیٹ سنک پر دھری، پانی پیا اور ہاتھ دھونے لگی۔

''چائے بناؤ۔'' اس کی سرد آواز گونجی تھی۔

وہ خاموشی سے کوکنگ رینج کی طرف بڑھ گئی۔ چائے بناتے ہوئے اسے یاد آیا، نجانے کتنے دن بیت چکے تھے، اسے اس نعمت سے لطف اندوز ہوئے، وہ چائے کی دیوانی تھی مگر یہاں تو دو وقت کھانا کھانا بھی ٹھیک سے یاد نہ رہتا تھا۔

چائے مگ میں انڈیل کر اس نے مگ اس کی طرف بڑھا دیا۔ وہ مسلسل اس پر نگاہ جمائے ہوئے تھا۔ وہ اندر ہی اندر لرز اٹھی۔ نجانے اب کون سی سزا سنائی جانے والی تھی۔

دو منٹ میں اس نے چائے ختم کر لی تھی۔ مگ اسے تھما کر وہ اٹھ گیا، اربیجہ نے خاموشی سے اسے جاتے دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت تھی۔ اس نے کپ دھو کر اسٹینڈ پر رکھا اور اس کے پیچھے چل پڑی۔ وہ اس کی خواب گاہ میں داخل ہوئی تو قدم من من بھر کے ہو رہے تھے۔ وہ لباس تبدیل کر کے ایزی چیئر پر جھول رہا تھا۔

''تمہیں لگتا ہے تم مظلوم ہو، تمہارے ساتھ ظلم ہو رہا ہے؟'' اس کی بھاری پر تحکم آواز

میں سوال تھا۔ وہ ہمیشہ ایسا ہی کرتا تھا، اسے مشکل میں ڈالنے والے سوالات کرتا تھا۔

اریبہ نے اپنی لرزتی ٹانگوں پر بمشکل قابو پایا اور قدرے مستحکم لہجے میں بولی۔

''سچ تو یہی ہے۔''

''خوب، تمہاری یہی بات اچھی ہے۔ تم کم بولتی ہو مگر خوب بولتی ہو۔'' اس کے لہجے میں گہرا طنز تھا۔

وہ غیر محسوس انداز میں سہم سی گئی۔

''تمہارے اس ذلیل بھائی کا پتا نہیں چل رہا۔ میرے آدمی چاروں طرف اسے ڈھونڈ رہے ہیں۔ قوی خیال یہی ہے کہ وہ علاقے غیر کی طرف نکل گیا ہے، مگر..... وہ بچ نہیں پائے گا۔ جب تک اس کے ٹکڑے کر کے ''ملک ہاؤس'' میں نہیں بھجواؤں گا سکون نہیں آئے گا''۔ اس کے لہجے میں خون آشام درندے کی سی پھنکار تھی۔ ضبط کرتے کرتے بھی اریبہ کی آنکھوں سے کئی آنسو لڑھک گئے۔

''رو کیوں رہی ہو؟'' وہ مزید غضب ناک ہوا تھا۔

''آپ مجھے کس جرم کی سزا دے رہے ہیں؟'' وہ جیسے سراپا سوال بن گئی تھی۔

''تم خود کو بے قصور سمجھتی ہو؟'' وہ دھاڑا۔ وہ لرز اٹھی مگر مضبوطی سے کھڑی رہی۔ آج تو وہ جیسے سارے حساب بے باق کرنے پہ تلی بیٹھی تھی، وہ کیوں سہے یہ ذلت، جب وہ بے قصور تھی۔

''منصور ملک نے میرے بھائی کو قتل کر ڈالا اور تم..... تمہیں لگتا ہے تم بے قصور ہو؟'' وہ اس کا بازو دبوچتے ہوئے غرایا تھا۔

''میں نے تو نہیں کہا تھا منصور لالہ سے کہ وہ.....'' ابھی بات اس کے منہ میں ہی تھی، جب شاہ فضل کا ہاتھ برق رفتاری سے اس کے گال پر پڑا۔ وہ درد کی شدت سے چلا اٹھی۔

''تم..... تم..... تمہاری اتنی جرأت کہ میرے سامنے بلند آواز میں بولو؟ میں تمہاری زبان کھینچ لوں گا تم.....'' وہ جنونی ہو کر اس پر جھپٹا اور اسے ٹھوکروں پہ رکھ لیا، وہ بلند آواز میں چیخ رہی تھی۔ اس کے پیروں کی پے در پے پڑنے والی ضربات نے اسے ادھ موا سا کر دیا تھا۔ وہ رو رہی تھی، معافیاں مانگ رہی تھی مگر وہ جیسے ہر صدا سے نا آشنا ہو چکا تھا۔

''ماریں، مجھے جان سے مار ڈالیں۔ مجھے مارنے سے اگر آپ کا بھائی واپس آ سکتا

ہے تو میری جان بھی لے لیں۔'' وہ بلند آواز سے روتے ہوئے بولی، وہ ایک دم رک گیا۔ چند لمحے اسے سرخ آنکھوں سے گھورتا رہا پھر اس کے بال مٹھی میں جکڑ لیے۔ وہ درد کی شدت سے بلبلا اٹھی۔

''تمہیں مارنے سے میرا بھائی تو واپس نہیں آئے گا، مگر میرے سینے میں لگی آگ پر چند چھینٹے ضرور پڑیں گے۔'' وہ سفاکی سے بولا۔

میرے لیے یہ سانسیں بھی
اتنی مشکل کیوں ہیں؟
میری آنکھوں کے آگے
اتنی دیواریں کیوں ہیں؟
میرے پیروں میں اتنی
زنجیریں کیوں ہیں؟
میرے ماتھے پر ایسی
تقدیریں کیوں ہیں؟

وہ جانتی تھی، اس کے لیے کوئی راہ فرار نہیں تھی۔ خوشی سے یا ناخوشی سے، بہر کیف اسے اس برزخ میں جلنا تھا، اس کے لیے کوئی روزن نہ تھا، اس کے لیے کوئی ہمدرد یا مسیحا نہیں آئے گا، اسے یہ یقین کر لینا چاہیے۔ حویلی کے دیگر افراد یکسر بے پروا ہو چکے تھے۔ بی بی جان سمیت اور اگر اسے اس طرح ہی زندہ رہنا تھا، اتنی ہی تذلیل و حقارت کے ہمراہ تو وہ زبان چلا کر اپنی سزا کو سخت کیوں کر رہی تھی۔ کیوں چپ چاپ سولی پر نہیں چڑھ جاتی کہ جب مقدر میں یہی تھا۔ اسے یاد تھا۔ اس نے کبھی ''ملک ہاؤس'' میں کچن کا کوئی کام نہ کیا تھا، اس کی ضرورت ہی پیش نہ آئی تھی، آگے پیچھے ملازمین کی فوج ہوتی تھی اور آج تقدیر نے اس سے کیسی دغا بازی کی تھی۔ وہ حالات کے اس رخ پر گنگ سی تھی۔ وہ تو بابا کی پری تھی جسے کبھی کسی نے پھولوں کی چھڑی سے بھی نہ چھوا تھا۔ آج وہ شخص، جو کہنے کو اس کا شرعی شوہر تھا، اس کے سر کا سائیں تھا، کیسے جانوروں کی طرح پیٹتا تھا اسے، معمولی معمولی سی غلطیوں پر وہ اس کی کھال ادھیڑ ڈالتا تھا۔ وہ کیوں اپنی زندگی کو اتنا مشکل بنا رہی تھی؟ زندگی آسان بھی ہو سکتی تھی اگر وہ خاموشی کی عادت ڈال لیتی۔ اس رات فرش پر زخموں سے بھرے وجود کے ساتھ اس نے سوچا اور ایک

پختہ فیصلہ کرلیا۔

☆☆☆

دن رات ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ سورج طلوع اور غروب ہو جاتا اربیحہ کی زندگی ان چیزوں سے ماورا ہو چکی تھی۔ اس کے لیے دن اور رات سب ایک جیسے تاریک تھے۔ کبھی کبھی اسے لگتا وہ تصویر اس کی زندگی کی بالکل حقیقی منظر کشی کر رہی تھی۔ وہ بھی تو ایسے ہی ایک سیاہ صحرا میں پھنس گئی تھی، پیاس نے نڈھال ہو چکی تھی اور کیسی تھی یہ پیاس؟ رشتوں کی پیاس، محبتوں کی پیاس؟ جس کی طلب کی شدت سے اس کی زبان باہر نکل آئی تھی، اس کے پیچھے وہ گھڑ سوار بھی ویسا ہی تھا جیسا شاہ فضل تھا، انتقام میں اندھا، پاگل، نفرت کا زہر اس کے اندر انڈیلتا۔

تذلیل، بے حسی اور بے التفاتی نے اس کے وجود کی ساری شادابی کو نچوڑ ڈالا تھا۔ رنگت میں زردیاں کھنڈ گئی تھی۔ آنکھوں کے گرد گہرے ہوتے حلقے اور پپڑی زدہ ہونٹ، وہ اربیحہ کا سایہ معلوم ہوتی تھی۔

اس وقت وہ اور ندرت دونوں کچن میں شام کا کھانا بنا رہی تھیں۔

''ندرت!''

''جی اربیحہ بی بی!'' وہ ادب سے بولی۔

''یہ اتنی ساری عورتیں بی بی جان کے پاس روز کیوں آتی ہیں؟'' اس نے حیرت سے کہا۔

''دعا کے لیے'' ندرت نے کہا۔

''کیا مطلب؟''

''بیگم سائیں کی دعا بڑی قبول ہوتی ہے جی۔'' ندرت نے عقیدت سے کہا۔

''اچھا..... میں بھی ان سے ایک دعا کے لیے کہوں؟'' وہ کچھ ہچکچا کر بولی۔

''کیوں نہیں بی بی؟ آپ کا تو حق ہے۔''

''حق؟ اونہہ.....!'' وہ کچھ کہتے کہتے رُک گئی۔ اس نے باہر دیکھا بڑا سا صحن اب خالی ہو رہا تھا۔ بھیڑ بتدریج چھٹتی جا رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی بی بی جان کے پاس آ بیٹھی۔ بڑی عقیدت سے ان کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ دیے۔

''میرے لیے بھی ایک دعا کیجیے بی بی جان!'' اس نے نم آنکھوں سے انہیں دیکھا۔

انہوں نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ دھرا اور کہا۔

''بول بیٹی!''

''میرے لیے دعا کیجیے بی بی جان! کہ اللہ تعالیٰ میری سانسیں مختصر کر دے۔ اب اور جینے کی خواہش نہیں رہی۔'' اس کی بند آنکھوں سے دو آنسو بہہ نکلے۔

بی بی جان کو جھٹکا سا لگا۔

''ایسے نہیں کہتے بیٹی! زندگی تو رب کی نعمت ہے۔'' انہوں نے اسے پیار سے جھٹکا۔

''بی بی جان! جب نعمت بوجھ لگنے لگے تو اس کا نہ ہونا ہی بہتر ہے۔'' وہ کرب ناک لہجے میں بولی تھی۔

ندرت حیرت سے پیچھے کھڑی سب سن رہی تھی۔

وہ اٹھی اور چلتی ہوئی واپس کچن کی طرف بڑھ گئی۔ اس بات سے بے خبر کہ ندرت خاموشی سے مردان خانے کی طرف بڑھ گئی تھی۔

☆☆☆

وہ معمول کے کام نبٹا کر مردان خانے کی طرف بڑھ گئی۔ دن کی مشقت اختتام پذیر ہو چکی تھی تو کیا ہوا، رات کی تو باقی تھی۔ بس زندگی اب جہد مسلسل کا نام ہی تو رہ گئی تھی۔

وہ اندر داخل ہوئی تو وہ فون پر کسی سے محو گفتگو تھا۔ اربیحہ خاموشی سے واش روم کی سمت بڑھ گئی۔ جب لوٹی تو اس کے بدن پر سفید سلکی نائٹی تھی۔ لبوں پر بے حد چمک دار سرخ لپ اسٹک تھی اور بال شانوں کا احاطہ کیے ہوئے تھے۔

یہ اس کا حکم تھا، جس کی اسے ہر حال میں تعمیل کرنا تھی۔

وہ بستر پر دراز ہو چکا تھا۔ اربیحہ جھک کر اس کے پیروں پر لحاف پھیلانے لگی، پھر پائنتی والی سائیڈ پر بیٹھ کر اس کے پیر دبانے لگی۔ یہ تو روز کا معمول تھا۔ سر جھکے ہونے کے باوجود بھی وہ شاہ فضل کی خود پر جمی نگاہ محسوس کر سکتی تھی۔ اس کی ہتھیلیاں بھیگنے لگیں۔

''آج بی بی جان سے کیا بات ہوئی تمہاری؟'' اس کی بھاری سرد آواز اربیحہ کو پسینے میں نہلا گئی۔

اس کا رنگ اتنی تیزی سے زرد پڑا کہ شاہ فضل کو لگا جیسے اس پر زرد رنگ کا پینٹ کر دیا

گیا ہو۔ کچھ کہنے کی کوشش میں اس کے لب کپکپائے، پھر باہم پیوست ہو گئے۔ اس نے سہمی ہوئی، ہراساں نگاہ اٹھا کر ایک نظر شاہ فضل کو دیکھا اور پھر فوراً سر جھکا لیا۔

''کیا پوچھ رہا ہوں میں؟'' اس کا لہجہ مزید سخت ہوا تھا۔ وہ ساری جان سے لرز گئی تھی۔

''وہ..... وہ ندرت نے بتایا تھا کہ بی بی جان کی دعا بہت..... بہت قبول ہوتی ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ وہ میرے..... میرے لیے بھی دعا کریں۔''

وہ رک گئی..... آگے ہمت ختم ہو چکی تھی۔ اس نے قدرے دلچسپی سے اسے دیکھا۔

''کیسی دعا؟''

''یہی..... یہی کہ.....'' وہ پھر رکی مگر بتانا لازم تھا۔ ''وہ میرے لیے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ میری سانسیں مختصر کر دے۔'' اس نے ہمت کر کے کہہ تو دیا تھا مگر اب دم سادھے اس کے ردعمل کی منتظر تھی۔

''بس اتنی خواہش ہے تمہاری؟'' وہ حیرت سے بولا اور ہاتھ بڑھا کر اسے نزدیک کر لیا۔

''یہ خواہش تو تمہاری، میں بھی پوری کر سکتا ہوں۔ دعاؤں سے زیادہ عمل پر یقین رکھتا ہوں۔'' اس کا ہاتھ اس کی گردن پر رینگنے لگا، اربیحہ کی سانس رکنے لگی۔ اس کی آنکھوں سے پانی نکلنے لگا مگر وہ بے حس و حرکت رہی۔

''تمہاری ایک چیز بہت اچھی ہے، تمہاری فرماں برداری..... مجھے یقین ہے، میں اگر تمہیں مار بھی ڈالوں تو تم مزاحمت نہیں کرو گی۔ ہے ناں؟'' وہ یقین چاہ رہا تھا۔

''جی سائیں!'' وہ دھیمے لہجے میں بولی۔ پورا وجود ہولے ہولے لرز رہا تھا۔

''مجھے ایک بات کی خوشی ہے اربیحہ! کہ تم اپنی زبان بہت کم استعمال کرتی ہو اور یہ تمہارے حق میں ایک پلس پوائنٹ بن جاتا ہے۔ جب تم حویلی آئی تھیں تو کافی بدتمیز تھیں۔ نہیں؟ اب تو کافی کچھ سیکھ چکی ہو۔ وہ بے رحمی سے اس کے دل کو کچوکے لگا رہا تھا۔

وہ لب کچلتے ہوئے آنسو روکنے کی کوشش کرتی ہلکان ہونے لگی۔

''اتنا ڈرتی کیوں ہو مجھ سے؟'' ایک بار پھر ایک مشکل سوال کا پھندا اس کے لیے تیار تھا۔

''کچھ پوچھا ہے میں نے تم سے؟'' اس نے کہتے ہوئے اربیحہ کو مزید اپنے قریب کر لیا۔

''پپ..... پتا نہیں.....'' اس کی سانسیں بے ترتیب ہونے لگیں۔

شاہ فضل نے لحاف اوپر کھینچا تو وہ مکمل طور پر لحاف میں چھپ گئی، پھر پتا نہیں کیا ہوا، وہ اس کے فرخ سینے میں منہ چھپا کر شدتوں سے رو پڑی۔

''مت رویا کرو اتنا'' اس کا موڈ خراب ہوا تھا۔

اربیحہ کی سسکیاں فوراً مدھم پڑی تھیں۔ خود پر قابو پاتے ہوئے وہ سونے کی کوشش کرنے لگی، مگر نیند کہاں؟؟

''اربیحہ!'' اس نے پکارا۔

''جی'' وہ مدہم سا بولی۔

لحاف کھسکا کر شاہ فضل نے اسے کا چہرہ دیکھا۔ رونے کے باعث آنکھیں متورم اور ناک سرخ ہو رہی تھی۔ وہ چند لمحے اسے دیکھتا رہا پھر بازوؤں میں بھینچ لیا۔

''کچھ نہیں، سو جاؤ'' اب کی بار اس کا لہجہ بدلا ہوا تھا۔

اگلی صبح بہت چمکدار اور نکھری ہوئی تھی۔ وہ خاموشی سے کمرے سے نکل آئی۔ لان میں جانے کی اجازت نہیں تھی اس لیے وہ جالی کے دروازے کے پاس آ بیٹھی، حالانکہ اسے بند کمروں سے ہمیشہ وحشت ہوتی تھی، وہ تو ''ملک ہاؤس'' میں ہمیشہ اپنے کمرے کی کھڑکی کھلی رکھتی تھی، اسی وقت ندرت اپنے آنچل میں ڈھیروں پھول سمیٹے اندر آئی۔ اسے یوں بیٹھا دیکھ کر چونک گئی۔

''کیا بات ہے بی بی! آپ ایسے کیوں بیٹھی ہیں؟''

''کچھ نہیں۔ ویسے ہی۔'' وہ اٹھ گئی۔

''تم مجھے اتنے احترام سے مت بلایا کرو ندرت! میری حیثیت تو تم سے بھی گئی گزری ہے۔'' وہ تلخی سے بولی۔

''آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں بی بی!'' ندرت حیران رہ گئی۔

''ٹھیک کہہ رہی ہوں۔'' وہ واپس پلٹ گئی۔

☆☆☆

آج شاہ فضل کو لاہور جانا تھا۔ اسے اس کو تیار ہونے میں مدد دینا تھی۔ وہ واپس مردان خانے کی طرف بڑھ گئی۔ وہ کمرے میں آئی تو وہ ابھی تک بے خبر سو رہا تھا۔ اس نے آہستگی سے اس کا شانہ ہلایا۔

''شاہ سائیں! اٹھ جائیں۔ آپ کو لاہور جانا ہے۔'' وہ آہستگی سے بولی۔ وہ تھوڑا سا کسمسایا پھر آنکھوں کھول دیں۔

''کپڑے نکال دو میرے۔'' لحاف پرے کرتا اٹھ بیٹھا۔

''جی! کیا پہنیں گے؟'' وہ لحاف سمیٹتے ہوئے بولی۔

''شلوار سوٹ نکال دو'' وہ واش روم کی سمت بڑھتے ہوئے بولا۔

اربیحہ سر ہلاتی ہوئی الماری کی سمت بڑھ گئی۔ کچھ دیر بعد وہ کریم کلر کے شلوار سوٹ میں ملبوس براؤن واسکٹ پہنے لوٹا تو بالکل روایتی جاگیردار لگ رہا تھا۔ بے پناہ وجیہہ و شکیل، سیاہ گیلے بال ماتھے پر بکھرائے وہ واقعی غضب ڈھا رہا تھا، اربیحہ چند پل اسے یک ٹک دیکھتی رہی، یہ سوچے بغیر کہ وہ بلا کا زیرک تھا، کیسے محسوس نہ کرتا، فوراً پلٹا، اسے اپنی طرف محویت سے دیکھتا پا کر بڑے جان دار انداز میں مسکرایا۔

''بس، ہار بیٹھی ہو دل۔'' وہ تمسخر سے ہنسا۔

اربیحہ کے سینے میں جیسے کسی نے زہر آلود خنجر پیوست کر دیا۔ اس کا رنگ پہلے زرد ہوا پھر سرخ، وہ خاموشی سے چہرہ جھکا کر گیلا تولیہ اٹھانے لگی۔ اس سے پہلے کہ وہ باہر نکلتی، بازو اس کی گرفت میں آ گیا۔

''جواب نہیں دیا تم نے میری بات کا؟'' اس کے لہجے میں محظوظ ہونے والی کیفیت تھی۔ دروازے پہ دستک کی آواز سن کر اس نے اربیحہ کا بازو چھوڑ دیا۔

اربیحہ نے بے دردی سے ہونٹ کاٹے۔ اسی وقت دروازہ کھلا اور ندرت اندر آ گئی۔

''سلام سائیں! صبح بخیر۔'' اس نے کلیوں کے چھوٹے چھوٹے ڈھیر سائیڈ ٹیبل پر رکھے اور واپس مڑ گئی۔

''ناشتہ کریں گے؟'' اربیحہ نے موقع غنیمت دیکھ کر بات بدلی۔

''نہیں چائے لے آؤ۔'' وہ بھی مڑ کر بال بنانے لگا۔ اربیحہ شکر کرتی باہر نکل آئی۔ تھوڑی۔ دیر بعد وہ چائے لے آئی۔ وہ دائیں ہاتھ سے مگ تھامے صوفے پر بیٹھ کر بائیں ہاتھ

سے موبائل پر کوئی نمبر ملانے لگا۔ اربیحہ نے اس کے موزے نکالے اور زمین پر بیٹھ کر جوتے پہنانے لگی۔

''تمہارے والد صاحب کا فون آیا تھا۔'' شاہ فضل نے جیسے اس کے سر پر بم پھوڑا۔ وہ بے یقینی سے اسے دیکھنے لگی۔

''تم بات کرنا چاہو تو کر سکتی ہو۔ میری طرف سے کوئی دباؤ نہیں ہے۔'' اس نے موبائل اربیحہ کی طرف بڑھایا۔ وہ کرنٹ کھا کر پیچھے ہٹی۔

''نہ..... نہ نہیں..... مجھے نہیں کرنا بات۔ مجھے ان لوگوں سے کوئی تعلق نہیں رکھنا، جنہوں نے اپنے بیٹے کو بچانے کے لیے اپنی بیٹی کو داؤ پر لگا دیا۔'' اس کا تنفس بے ترتیب تھا اور بڑی بڑی غلافی آنکھوں یک لخت آنسوؤں سے لبالب بھر گئی تھیں۔

شاہ فضل نے لاپروائی سے شانے جھٹکے اور موبائل جیب میں ڈال کر اٹھ گیا۔

''فی امان اللہ'' اربیحہ نے آہستگی سے کہا۔ شاہ فضل کے دل کو کچھ ہوا۔ وہ بے اختیار پلٹا اور اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ اربیحہ کی آنکھیں چھلک اٹھیں۔

پھر آہستگی سے اس سے الگ ہو گئی۔ شاہ فضل کے ہاتھ نے نرمی سے اس کے گال کو تھپ تھپایا اور واپس مڑ گیا۔

وہ ساکت و صامت سی کھڑی تھی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ شاہ فضل تھا، اتنا نرم، اتنا مہربان؟

اس نے بے یقینی سے اپنے گال کو چھوڑا جو ابھی تک اس کے ہاتھ کے لمس سے دہک رہا تھا۔

☆☆☆

اربیحہ معمول کے مطابق رات کے کھانے کے بعد کچن صاف کر رہی تھی جب اس نے ندرت کو اندر آتے دیکھا۔

''تم یہاں اس وقت؟ کیا بات ہے؟'' اربیحہ نے حیرانی سے پوچھا، رات کے گیارہ بج رہے تھے۔

ندرت نے اضطرابی انداز میں انگلیاں چٹخائیں اور پریشانی سے اسے دیکھا تھا۔

''کیا بات ہے ندرت؟'' وہ الجھ گئی۔

''وہ، اربیحہ بی بی! آج فیصل سائیں کا جنم دن ہے۔'' اس نے کچھ جھجکتے ہوئے بتایا۔ اربیحہ کو جھٹکا سا لگا۔

''کیا؟ شاہ سائیں کدھر ہیں؟'' اس نے فوراً پوچھا۔

''وہ، میں نے ناں، ابھی ابھی انہیں فیصل سائیں کے کمرے میں جاتے دیکھا ہے۔ آپ سے مجھے کہنا تھا کہ آپ خاموشی سے اپنے کمرے میں ہی سو جائیں۔ مردانے میں مت جایئے گا۔'' اس نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے ازراہ ہمدردی کہا۔

''کیوں؟''

''وہ جی، انہیں آپ کو دیکھ کر پھر غصہ آ جائے گا۔'' اس نے سمجھایا۔ اربیحہ کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ ہنسے یا روئے۔ کون سے غصے کی بات کر رہی تھی وہ؟

وہ غصہ، وہ طیش اور وہ اشتعال جسے جھیلتے ہوئے وہ اتنی سخت جان ہو گئی تھی کہ اسے خود حیرانی ہوتی تھی۔

''اچھا ٹھیک ہے۔'' اس نے تسلی دلائی اور پلٹ کر سنک میں ہاتھ دھونے لگی۔ ندرت مطمئن ہو کر واپس مڑ گئی۔

اس کے جانے کے بعد اربیحہ نے ایک طائرانہ نظر کچن پر ڈالی اور لائٹ آف کر کے دروازہ بند کرتی باہر آ گئی۔

اس کے قدم مردانے کی سمت بڑھ رہے تھے۔ اس نے شاہ فیصل کے کمرے، جو اس نے ہمیشہ بند ہی دیکھا تھا، کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گئی۔ سامنے ہی شاہ فضل کھڑا تھا۔ دروازے کی طرف اس کی پشت تھی۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر وہ مڑا اور اربیحہ نے دیکھا اس کے ہاتھ میں فوٹو فریم تھا۔ غالباً نہیں یقیناً اس میں شاہ فیصل کی تصویر تھی۔

اربیحہ نے شاہ فضل کا چہرہ دکھ اور لرز گئی۔ کتنا درد تھا اس چہرے پر، کتنا کرب! یوں جیسے کائنات کی ہر اذیت، روئے زمین کا ہر دکھ اور سات سمندروں کی پیاس اس کے چہرے پر سمٹ آئی تھی۔ اس کی چمک دار آنکھیں کتنی کرب آمیز محرومی سے آویزاں تھیں۔ اس کی مغرور کھڑی ناک پہ کتنی بے بسی تھی۔ اتنے محروم اور اتنا پر وحشت چہرہ! اربیحہ کو لگا یہ چہرہ اس کا اپنا تھا۔ بالکل ایسا ہی تو تھا اس کا چہرہ! محرومیوں کی دھوپ میں اٹا، رشتوں کی پیاس میں بھٹکا ہوا۔

آہ!

ہم اپنے دلوں کو
اپنی اپنی مٹھیوں میں
اتنی زور سے جکڑ لیں
کہ شریانوں میں پھوٹنے والا کرب
یہیں کہیں گم ہو کر رہ جائے

وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھی اور اس کے مقابل آ کر ٹھہر گئی۔

''کیوں آئی ہو یہاں؟ میری آگ کو بھڑکانے یا میرے احساس زیاں کا اندازہ لگانے کے لیے؟'' وہ بہت ٹوٹے لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

وہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔

''آج فیصل کا جنم دن ہے اگر..... اگر وہ ہوتا تو آج وہ بائیس سال کا ہو جاتا۔'' اس کا لہجہ کتنا خالی تھا۔

''آپ بہت پیار کرتے تھے ان سے؟'' وہ پتا نہیں کیوں پوچھ بیٹھی تھی۔

''ہاں۔ بہت پیار کرتا تھا میں اس سے..... یہ دیکھو، دیکھو..... اس کمرے میں ہر چیز میری پسند کی ہے۔ وہ میری پسند کو اولیت دیتا تھا۔ ہمیشہ جب حویلی آتا تو کہتا۔

''لالہ! آپ اب شادی کر لیں۔'' اور میں ہر بار ہنس دیتا۔ میں کہتا۔

تم اپنا ایم بی اے پورا کر لو۔ پھر اکٹھے ہی کر لیں گے۔''

اور وہ فوراً بدک جاتا۔ ''میں..... میری کیوں؟'' اور میں کہتا۔

''ارے بھئی! مجھے تمہارے بغیر کام کرنے کی عادت نہیں ہے نا! اور شادی کے لیے مورل سپورٹ تو مجھے تم ہی سے ملے گی، جب مجھے پتا چلے گا کہ قربان گاہ میں صرف میں ہی نہیں، تم بھی ہو۔''

وہ آگے سے بس ہنستا جاتا اور میں جو کبھی بلند آواز میں ہنسنا پسند نہیں کرتا تھا۔ اس کے آنے پر یہ حویلی میرے قہقہوں سے گونجا کرتی تھی۔ یہ دیکھو۔''

شاہ فضل نے ہاتھ میں پکڑی تصویر اسے دکھائی۔

اربیحہ نے دھندلی نظروں سے دیکھا۔

مسکراتے ہوئے دو چہرے اس کے سامنے تھے۔

''شاہ فضل اور شاہ فیصل۔''

وہ تصویر سائیڈ ٹیبل پہ رکھ کر الماری کی سمت بڑھ گیا۔ اس نے دونوں پٹ کھول دیے۔ اندر آج بھی اس کے کپڑے اسی طرح سجے تھے۔ شرٹس، جینز، ٹائیاں، تھری پیس، شلوار کرتے، اجرکیں اور جیکٹیں۔

''یہ سب اس نے میرے ساتھ جا کر خریدے تھے۔''

اس نے تھکے ہوئے انداز میں پٹ بند کر دیے اور ان سے پشت ٹکا دی۔

''ہر صبح میں انتظار کرتا ہوں کہ میرے سیل پر کال آئے گی اور وہ ہنستے ہوئے کہے گا۔''

''لالہ! آپ بہت یاد آ رہے ہیں۔ آپ میرے پاس آ جائیں۔''

اور میں اسے ڈانٹ دوں گا اور کہوں گا۔ ''تم خود آ جاؤ میں بہت مصروف ہوں''

لیکن ہر صبح، ہر شام اور ہر رات میرا دل صرف انتظار ہی کرتا رہتا ہے اور میرا فون..... اس پر کوئی بیل نہیں بجتی۔ حالانکہ رنگ ٹون اس نے خود سیٹ کی تھی۔ کہتا تھا ''تھوڑے سے ماڈرن ہو جائیں۔''

''اب وہ نہیں آئے گا۔ اب تو صرف میں اس کے پاس جاؤں گا۔'' اس نے نچلا لب دانتوں سے کچل ڈالا۔

''مگر یہ انتظار..... ختم نہیں ہوتا۔ بہت روکا تھا میں نے اسے بہت سمجھایا تھا کہ وہ منصور ملک سے دوستی ختم کر دے، مگر وہ مانا ہی نہیں۔ وہ تو میری ہر بات مانتا تھا، حکم سمجھ کر۔ جو میں کہتا، اس پر کرنا لازم ہو جاتا، مگر پتا نہیں منصور ملک کے معاملے میں اس نے میری بات کیوں نہ مانی؟

کیا دشمنی تھی اسے میرے فیصل سے! کیوں اس نے ایسا کیا؟

کیوں اس نے میرے وجود کا ٹکڑا چھین لیا مجھ سے؟ کیوں ادھورا کر دیا مجھے؟ کیا بگاڑا تھا میرے فیصل نے اس کا؟''

اس کے لہجے میں ٹوٹی کرچیوں کی سی چبھن تھی۔

''میرا دل چاہتا ہے کہیں سے ایک بار منصور میرے سامنے آ جائے اور میں اس سے پوچھوں کہ مجھے فیصل کی وہ غلطی تو بتا دے، جس کی پاداش میں اس نے اتنے بے رحمانہ طریقے

سے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔''

اس کی آنکھوں کی سرخی بتدریج گہری ہونے لگی تھی۔

اربیحہ کو لگا وہ ابھی رو دے گا۔

''آج میرے سیل پہ اس کے کتنے ہی دوستوں کی کالز آئی تھیں۔ وہ سب اس کی سالگرہ منا رہے تھے، اس کے نہ ہونے کے باوجود۔ کوئی میرے دکھ کا تو مداوا کرے۔ وہ مجھے نظر کیوں نہیں آتا۔ میں کسی بھٹکی ہوئی روح کی مانند اس حویلی میں چکراتا رہتا ہوں۔ یہ حویلی، یہ گاؤں، یہ کھیت کھلیان، ہر جگہ اس امید پر کہ وہ مجھے کہیں تو دکھائی دے گا۔ اس کی ہنسی میں ایک بار پھر سن سکوں گا، مگر میرا انتظار، انتظار، ہی رہ جاتا ہے۔''

اس کی گردن جیسے غم کے بوجھ سے بھاری ہو کر سینے پہ گر گئی۔ وہ تھکے ہوئے انداز میں کارپٹ پہ بیٹھ گیا۔

''ایک بار نفسیات کے پروفیسر نے ہیومن ایڈکشن کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہم جب زندگی میں کسی دوسرے شخص کے ساتھ کے عادی ہو جاتے ہیں تو یہ نشہ کی طرح ہماری طلب بن جاتا ہے۔ یہ شخص ہماری زندگی سے نکل جاتا ہے، ہمیں چھوڑ دیتا ہے اور ہم سے بہت دور چلا جاتا ہے تو ہم اذیت و درد کے ناقابل بیان تجربے سے گزرتے ہیں۔

''یہ اذیت مجھے مستقبل کی طرف نہیں بڑھنے دیتی۔ مجھے اندر سے کاٹتی رہتی ہے، بالکل کسی نگلے ہوئے بلیڈ کی طرح..... اور یہ اذیت مجھے ایک جنونی کیفیت میں دھکیل دیتی ہے۔ میرا دل چاہتا ہے میں ہر چیز تہس نہس کر دوں۔ میں..... میں تمہیں دیکھتا ہوں تو تمہارے چہرے میں مجھے منصور کا چہرہ نظر آتا ہے۔ وہ قاتل چہرہ جسے یاد کر کے میرا خون کھول اٹھتا ہے اور میں خود پر سے اختیار کھو دیتا ہوں۔ تمہیں اذیت دینے کی خواہش ہوتی ہے پھر میں یہ بھی بھول جاتا ہوں کہ تم اربیحہ ہو، منصور ملک نہیں ہو.....

لیکن سکون پھر بھی نہیں ملتا۔ شاید وہ کبھی نہیں مل سکے گا۔ یہ ذہنی خلجان شاید مجھے پاگل کر کے چھوڑے گا۔'' اس نے اپنے بال مٹھیوں میں جکڑ لیے۔

''تم چلی جاؤ یہاں سے۔ کم از کم آج میں تمہیں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ اس سے پہلے کہ میں ایک بار پھر خود پر سے اختیار کھو دوں، تم جاؤ، جاؤ، وہ بلند آواز میں دھاڑا تھا۔ اربیحہ نے ہراساں ہو کر اسے دیکھا اور اضطراری انداز میں واپس مڑی اور بھاگتی ہوئی باہر نکل گئی۔

اپنے کمرے میں آ کر اس نے مضبوطی سے دروازہ بند کیا اور بیڈ پر گر گئی۔ اس نے دونوں ہاتھ اپنے چہرے پر پھیرے تو اسے احساس ہوا کہ اس کے چہرے سے آگ کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔

''تم ٹھیک کہتے ہو شاہ فضل! تم حقیقتاً وہ نہیں ہو۔ جو میرے لیے ہو۔ تم صرف انتقام میں اندھے ہو رہے ہو، تمہیں ایک نہ ایک دن اپنی غلطی کا احساس ضرور ہوگا، لیکن اربیجہ ملک اس وقت تک شاید زندہ نہ رہے.....

منصور لالہ، یہ آپ نے کیا کر دیا ہے۔ آپ کو شاید احساس ہی نہیں کہ آپ نے اس حویلی کے ساتھ کتنا بڑا ظلم کر دیا ہے۔''

پہلی بار اسے منصور ملک سے شکایت ہوئی تھی۔ وہ اس کے خلاف سوچ رہی تھی اور پہلی بار اسے شاہ فضل حق پر نظر آ رہا تھا۔

وہ بھی لاشعوری طور پر اسی ''ہیومن ایڈکشن'' کا شکار ہو رہی تھی۔

ہمارے صبر کو نیزے کی صورت
غموں کے دل میں گڑنا آ گیا ہے

☆☆☆

دسمبر کی اولین صبح بے حد خنک اور برفیلی تھی۔ حویلی میں جیسے اس سردی کا کوئی اثر ہی نہ تھا۔ تقریباً سب ہی ملازمین اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے اربیجہ بھی اس ٹھٹھرتی ہوئی سردی میں کچن میں مصروف تھی۔ شاہ فضل کے لیے ناشتہ بناتے ہوئے اسے سردی کے باعث جھرجھریاں سی آ رہی تھیں اس نے بڑا سا چائے کا مگ رکھا اور ٹرے لرزتے ہاتھوں میں تھامتے ہوئے باہر کی سمت بڑھ گئی۔ مردانے کی سمت بڑھتے ہوئے اس نے اپنے سرد ہاتھوں میں پکڑی ٹرے کو بمشکل تھاما ہوا تھا ورنہ اسے یوں لگ رہا تھا کہ ٹرے اب لڑھکی کہ تب۔

وہ شاہ فضل کے کمرے سے کچھ ہی دور تھی جب اچانک پتا نہیں کیا ہوا، وہ سامنے سے آتے شاہ محمود کو دیکھ ہی نہیں پائی۔ ایک زوردار ٹکراؤ کے نتیجے میں سب کچھ زمین بوس ہو گیا۔

اربیجہ کے حلق سے ایک اذیت بھری چیخ نکلی، گرم چائے نے اس کے پیر جلا ڈالے تھے۔ کچھ چائے شاہ محمود کے کپڑوں کو بھی داغ دار کر گئی، وہ بے اختیار دھاڑ اٹھے۔

''تم..... بے وقوف! اندھی ہو گیا؟ دیکھ کر نہیں چل سکتیں؟'' ان کا ہاتھ بے اختیار

اٹھ گیا تھا۔

وہ زرد رنگت لیے لرز رہی تھی۔ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ ایک قدم پیچھے ہٹ کر اپنے پیر میں چبھی ہوئی وہ کرچی نکال سکتی جو اسے بے حد تکلیف دے رہی تھی۔

شاہ محمود کی دھاڑ سے پورا مردان خانہ گونج رہا تھا۔

''منحوس! میرا بیٹا کھا لیا تمہارے بھائی نے..... اب تم کیا چاہتی ہو۔ مجھے مت دکھایا کرو اپنی شکل۔ جی چاہتا ہے گولی مار دوں تمہیں..... ذلیل..... دور ہو جاؤ میری نظروں سے.....''

وہ اپنی بھڑاس نکال رہے تھے۔

اسی وقت شاہ فضل کے کمرے کا دروازہ کھلا، وہ تیزی سے باہر آیا۔ گیلے بال ماتھے پہ بکھرائے، وہ غالباً نہایت عجلت میں باتھ روم سے باہر نکلا تھا۔

''کیا بات ہے بابا سائیں؟'' اس نے معاملے کی نوعیت سمجھ لینے کے باوجود استفسار ضروری سمجھا تھا۔

''اسے چلنے کی تمیز سکھاؤ۔'' وہ سرد لہجے میں کہتے دوبارہ اپنے کمرے کی طرف مڑ گئے۔ یقیناً لباس تبدیل کرنے کے خیال سے۔

شاہ فضل نے اربیجہ کو دیکھا۔ خطرناک حد تک زرد رنگت لیے لرزتے وجود کے ساتھ وہ آنسو ضبط کرنے کی کوشش میں نڈھال سی ہو رہی تھی۔ اس نے اربیجہ کا بازو پکڑا اور اسے کمرے میں لے گیا۔ وہ کسی بے جان گڑیا کی طرح کھنچی چلی گئی۔ اسے اندر لا کر صوفہ پہ بٹھایا اور خود دراز کھول کر اس کے پیروں پہ لگانے کے لیے مرہم ڈھونڈنے لگا۔ تھوڑی سی تلاش کے بعد وہ مطلوبہ مرہم نکال کر اس کے پاس آ گیا۔

اور..... اور پھر..... اس صدی کا سب سے حیرت انگیز واقعہ ہوا تھا۔ وہ اس کے پیروں کے نزدیک جھک کر بیٹھ گیا۔ اس نے انگلی کی پور سے مرہم لگانی شروع کی۔ جیسے ہی اس کے ہاتھ نے اربیجہ کا پیر چھوا، اربیجہ کے تن مردہ میں جیسے جان سی پڑ گئی۔ اس نے بے ساختہ سسکی کی بھری اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ بنا کوئی ردعمل ظاہر کیے اپنا کام کرتا رہا۔ مرہم لگانے کے بعد ٹشو سے ہاتھ صاف کیے اور اس کے برابر بیٹھ گیا۔

''اربیجہ! ادھر دیکھو۔'' اس نے ہاتھ اربیجہ کے شانوں پہ دراز کر کے اسے قریب کر لیا۔

''کیا ہوا تھا؟ بتاؤ مجھے۔'' اس کا لہجہ نرم تھا۔

''مم..... میں نے..... میں نے جان بوجھ کر..... نہیں گرایا۔ مجھے پتا ہی نہیں چلا۔ پتا نہیں کیسے ٹرے میرے ہاتھوں سے چھوٹ گئی۔'' وہ روتے ہوئے اسے یقین دلا رہی تھی۔

شاہ فضل نے سمجھنے والے انداز میں سر ہلایا۔

''پھر؟''

''چائے ان پر گر گئی۔ جس پر انہیں غصہ آ گیا۔ میں..... میں سچ کہہ رہی ہوں۔ میں نے جان بوجھ کر نہیں کیا۔'' اس کا سر جھکا ہوا تھا۔

شاہ فضل نے دائیں ہاتھ سے اس کا چہرہ اوپر کیا جو آنسوؤں سے تر بتر تھا اور پھر..... یک لخت چونکا۔ اس کی نظر اربیجہ کے گال پر جم گئی۔ عضلات کھنچ گئے اور بھوؤں کے بیچ ایک شکن آ گئی۔

''انہوں نے ہاتھ اٹھایا تم پر؟'' اس کے لہجے سے ہی ظاہر تھا کہ اسے کس قدر ناگوار گزرا تھا۔

اربیجہ نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔ شاہ فضل کے لب بھینچ گئے۔ اس نے اربیجہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھایا اور بیڈ تک لے گیا۔

''لیٹ جاؤ۔ تم ٹھیک نہیں ہو۔'' اس نے حکم دیا مگر اتنے نرم لہجے میں؟ اربیجہ دنگ سی لیٹ گئی۔ وہ اس پر سرخ شنیل کا لحاف برابر کر کے اٹھا اور سینٹرل ہیٹر آن کرنے لگا۔ اس کے بعد اس نے ندرت کو بلا کر گرم دودھ اور ابلے ہوئے انڈے لانے کا کہا۔ فوراً ہی حکم کی تعمیل کی گئی تھی۔ اس نے انڈے اور کانٹا اس کی طرف بڑھایا، وہ کھانے لگی، پھر دودھ کا گلاس پکڑایا۔ اس نے گھونٹ گھونٹ دودھ پیا اور گلاس واپس ٹرے میں دھر دیا۔ ندرت نے ٹرے اٹھائی اور شاہ فضل کی طرف مڑی۔

''آپ کے لیے ناشتہ لاؤں؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں۔ اب تم جا سکتی ہو۔'' اس نے کہا۔

وہ خاموشی سے چلتی باہر نکل گئی۔ اس کے باہر نکلنے کے بعد شاہ فضل نے دروازہ کا بولٹ چڑھایا اور اس کے قریب آ گیا۔ اربیجہ کے پیروں پہ لگی مرہم جذب ہو چکی تھی۔

''تم تھوڑی دیر کے لیے سو جاؤ۔ میں یہیں ہوں۔'' وہ اس کے قریب نیم دراز ہو گیا۔

اربیجہ نے بے بسی سے اسے دیکھا اور پلکیں موند لیں۔ ایک ایک کر کے کتنے ہی آنسو

بے اختیار گرتے چلے گئے تھے۔

''کیا بات ہے؟'' وہ الجھا تھا۔

''میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔'' اس نے جھوٹ بولا۔

وہ یہ نہ کہہ سکی کہ ''شاہ فضل! اتنا نرم رویہ'' اتنی توجہ اور اتنی کیئر نہ دو مجھے میں تو تمہارے ظلم و زیادتی کی عادی ہو چکی ہوں۔ اب یہ مجھ سے برداشت نہیں ہوگا۔''

شاہ فضل خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ اس کے دل و دماغ کے درمیان ایک جنگ سی چھڑ گئی تھی۔

''کیا یہ مظلوم لڑکی اس قابل نہیں شاہ فضل! کہ تم کچھ دیر کے لیے ہی اسے اپنے ہاتھوں کی نرمی بخش دو۔ کیا یہ بے گناہ لڑکی اس قابل نہیں؟ تمہاری وحشتوں کے چراغ اپنے لہو سے جلانے والی یہ لڑکی جسے تم نے جی بھر کے روندا ہے اس قابل نہیں؟'' کوئی اس کے اندر بولا تھا۔

وہ ہار گیا۔

اس نے اپنا دایاں ہاتھ بڑھایا اور اس کی پیشانی پہ دھر دیا۔ اربیجہ کی آنکھیں پٹ سے کھل گئیں۔ اس کی نظروں سے ملیں اور جھک گئیں۔ وہ نرم ہاتھ رکھتے ہوئے اس کا سر دبانے لگا۔

اربیجہ کے اندر رم جھم سی ہونے لگی تھی۔ ایک لذت آمیز سکون اس کی رگ رگ میں سرائیت کر گیا۔ وہ کب نیند کی وادی میں اتر گئی، پتا ہی نہ چل سکا۔

☆☆☆

''میں ایک بات سوچ رہی ہوں ندرت!'' اس نے رات کے کھانے کے لیے تیز تیز چاول چنتے ہوئے ندرت سے کہا۔

وہ جو بڑے دھیان سے سالن پر کٹا دھنیا چھڑک رہی تھی، چونکی۔

''کیا بات ہے؟''

''کیا.....؟'' وہ رک سی گئی۔ ''کیا شاہ سائیں شروع سے ہی اتنے غصے والے ہیں؟'' اس کے سوال میں اتنی سادگی اور چہرے پہ ایسی معصومیت تھی کہ ندرت کو پیار آ گیا۔

''نہیں اربیجہ بی بی! وہ بس کچھ سنجیدہ مزاج تھے مگر ''اتنے'' غصے والے واقعی نہیں تھے

مگر جب سے فیصل سائیں گئے ہیں نا تو کسی نے مسکراتے نہیں دیکھا۔ ہنسنا تو جیسے بھول گئے ہیں۔ کبھی کبھی بیگم سائیں بہت روتی ہیں۔ کہتی ہیں میری قسمت میں میرے بچوں کی خوشی تھی ہی نہیں۔ ایک کے لیے تو صبر کرلوں کہ اس کی زندگی ہی اتنی تھی، مگر اس کا کیا کروں جو جیتا جاگتا آنکھوں کے سامنے ہے، مگر اس طرح کہ لاشے کا سا گمان ہوتا ہے۔ نہ خود سکون میں ہے اور نہ وہ معصوم بچی، جس کو مفت میں بیٹھے بٹھائے عذاب بھگتنا پڑ گیا۔''

اربیحہ چاول چن چکی تھی، جب ہی سنک میں دھونے کے لیے مڑ گئی کچن میں خاموشی تھی ندرت سالن کو دم لگا کر باہر جا چکی تھی وہ بڑے مگن سے انداز میں ہاتھ چاولوں میں ڈبوئے ہوئے چھپ چھپ کر رہی تھی بے خیالی میں دوپٹہ سر سے کھسک کر کندھوں پر ڈھلک آیا تھا، اس نے چاول دھو کر باؤل شیلف پر دھرا تھا جب اپنے پیچھے قدموں کی آہٹ سن کر مڑی اور حیران رہ گئی۔

اس کے عین سامنے شاہ فضل کھڑا تھا۔

وہ قدم قدم چلتا اس کے سامنے آ گیا۔ اربیحہ دم سادھے اسے دیکھ رہی تھی۔ یک لخت شاہ فضل نے ہاتھ آگے بڑھائے، وہ جھجک کر پیچھے ہونے لگی تھی کہ اس نے اربیحہ کا ڈھلکا آنچل اٹھا کر اس کے سر پر ڈال دیا۔

''چادر عورت کی عزت ہوتی ہے اربیحہ! اپنی عزت کی حفاظت کرنا سیکھو۔'' اس کا لہجہ مدھم تھا۔

وہ ساکت سی اسے دیکھتی رہی۔ اپنی بات مکمل کر کے وہ رکا نہیں بلکہ چلا گیا۔

وہ ایک دم سے جیسے حواسوں میں لوٹ آئی اور پھر..... پھر اس نے اس ناقابل بیان خوشی کو محسوس کرنے کی کوشش کی جو اس کے اندر پھیل رہی تھی۔ یہ احساس کتنا جاں فزا تھا کہ شاہ فضل کو اس کا احساس تھا۔ وہ اسے اپنی عزت مانتا تھا۔ اسے فرق پڑتا تھا۔

اس نے کھڑکی سے لان کے پودوں اور پتوں پر چمکتی دھوپ کو دیکھا اور اسے اپنا دل بھی ان ہی کی طرح چمکتا دمکتا لگا تھا۔

پتا نہیں یہ سب کیا تھا، شاید کسی نئے جذبے کا نقطہ آغاز یا شاید کسی نئی کہانی کا عنوان؟

☆☆☆

وہ آج گھر پر ہی تھا صبح سے ہی وہ اس کے معمولات کا گہری نگاہ سے جائزہ لے رہا تھا

صبح کا ناشتہ بنانے کے بعد وہ ملازماؤں کے ساتھ صفائی ستھرائی میں لگ گئی دوپہر ہوئی تو کھانے کی تیاری شروع کر دی اس دوران وہ ایک آدھ بار کمرے میں بھی آئی تھی۔ چپ چاپ دبے پاؤں، وہ لائٹ آف کیے پڑا ہوا تھا شاید وہ یہی سمجھی کہ وہ سو رہا ہے جب ہی تو یوں گربہ پائی سے چلتی اندر آئی تھی۔

جب وہ دوپہر کا کھانا لے کر اندر آئی تو اس کے ساتھ شاہ محمود کو بیٹھا دیکھ کر جھجک سی گئی۔ اس نے ٹرے سائیڈ ٹیبل پر دھری۔

''ادھر آؤ لڑکی۔'' ان کی پر تحکم آواز گونجی۔

وہ سہم سی گئی۔

''کیسی بے حس اور ذلیل لڑکی ہو تم؟ تمہیں احساس ہے کہ میرا بچہ صبح سے اس کمرے میں پڑا ہے تم نے نہ پوچھنا گوارا کیا، نہ بتانا؟'' وہ سخت لہجے میں باز پرس کر رہے تھے۔

اس نے ہراساں ہو کر شاہ فضل کی صورت دیکھتی ''میں سمجھی آپ سو رہے ہیں''

''تم اپنی سمجھ اپنے پاس رکھو اور آنکھیں کھول کر رکھا کرو'' انہوں نے تحقیر آمیز انداز میں کہا۔ فضل نے ان کی بات اچکی۔

''اربیحہ! تم جاؤ اور میرے لیے چائے لے کر آؤ اور ساتھ میں سر درد کی ٹیبلٹ بھی''

شاہ فضل کو جیسے اس لمحے اس پر ترس آ گیا تھا۔

''فضل! اسے اتنا سر پہ مت چڑھاؤ..... اور تم واپس آؤ اور اس کا سر دباؤ۔ کیا ضرورت ہے فضول دوائیاں لینے کی'' وہ جیسے بھڑک سے اٹھے تھے۔

''بابا سائیں! رہنے دیجیے سب ٹھیک ہے۔'' اس نے اکتا کر ہاتھ اٹھایا تھا، پھر لحاف سائیڈ پہ کرتا اٹھا اربیحہ نے فوراً سلیپر ڈھونڈ کر اس کے آگے رکھے۔

''میں چینج کرنے جا رہا ہوں، تم چائے بنا کر لاؤ۔'' وہ کہتا ہوا ڈریسنگ روم کی سمت بڑھ گیا۔

اربیحہ شش و پنج میں کھڑی تھی۔ شاہ محمود تنے ہوئے چہرے کے ساتھ اٹھے اور زور سے اجرک جھاڑ کر بازو پہ لپیٹی اور اسے قہر آلود نگاہ سے نواز کر باہر نکل گئے۔

ان کے جانے کے بعد اربیحہ نے ایک طویل پرسکون سانس لیا اور کچن کی طرف نکل گئی۔ جب وہ چائے بنا کر لوٹی تو فضل گیلے بال لیے کف چڑھا رہا تھا۔

اربیحہ نے دیکھا سیاہ شلوار قمیض اس کے دراز قد اور سرخ وسفید رنگت پہ خوب جچ رہا تھا۔ اس کی چوڑی ہتھیلی بڑے لاپروا انداز میں کف کو الٹ رہی تھی بالکل ویسے جیسے لاپروائی سے وہ زندہ وجودوں کو الٹ پلٹ دیا کرتا تھا اس کے دل کو یکدم کچھ ہوا تھا ہتھیلیوں میں نمی اترنے لگی تھی۔ ہو گیا میرا جائزہ مکمل وہ اس کی چوری پکڑ چکا تھا جب ہی بڑے سکون سے اسے بے سکون کر گیا۔

شرمندگی کے احساس سے اربیحہ کا چہرہ تپ اٹھا اس نے نظریں جھکا لیں۔

پھر وہاں سے کھانے کی ٹرے اٹھائی اور مڑی۔

''جا کہاں رہی ہو؟'' چائے کا کپ اٹھا کر اس نے پوچھا۔

''میں یہ واپس رکھ آؤں'' اسنے اتنی آہستگی سے کہا کہ وہ بمشکل سن پایا۔

''یہاں بیٹھو اور کھانا کھاؤ۔'' اس نے قطعیت سے کہا۔ اشارہ بیڈ کی طرف تھا۔ وہ عجیب مشکل میں پھنس گئی۔

''تم سے کہہ رہا ہوں میں'' اس نے قدرے بلند آواز میں جتایا۔

وہ گڑبڑا کر بیٹھ گئی۔ پھر بے بسی سے سامنے سجی نعمتوں کو دیکھا اور چھوٹی پلیٹ میں تھوڑے سے چاول ڈالکر ہاتھ سے نوالے لینے لگی شاہ فضل کی نگاہ بڑی گہرائی سے اس کا تجزیہ کر رہی تھی۔

جب تک اس نے چائے ختم کی تب تک وہ بھی چاول ختم کر چکی تھی۔ اس نے ٹرے اٹھایا اور اٹھنے لگی۔ شاہ فضل کو اس پل وہ بہت تھکی تھکی، پژمردہ اور اداس سی لگی تھی۔

''لائٹ آف کر دوں؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں، تم یہ سب چیزیں رکھ کر واپس آؤ، فضل نے کہا

اربیحہ خاموشی سے پلٹ گئی۔ شاہ فضل کی نگاہ نے دروازے تک اس کا پیچھا کیا۔

اسے اس پل وہ ''اربیحہ ملک'' یاد آئی جیسے اس نے نکاح کے دو روز بعد دیکھا تھا۔

دودھیا رنگت، مومی سانچے میں ڈھلا وجود اور چہرے پر موجود ملائمت بھری معصومیت۔

آج یہ کون سی ''اربیحہ شاہ'' تھی زرد رنگت، بجھی آنکھیں لیے جن میں اب صرف کرب تھا اس نوخیز کلی کا سارا وجود بہت ہارا ہوا تھا۔ وہ بیک وقت اس سے نفرت بھی کر رہا تھا اور اس پر ترس بھی کھا رہا تھا۔ وہ جیسے خود کو ہی سمجھ نہ پا رہا تھا۔

وہ اس کی مستقل مزاجی اور صبر پہ حیران تھا۔ وہ ابتدائی دنوں میں ضرور آگے سے بولی تھی مگر بعد ازاں اس نے گویا لبوں پر مہر لگا لی تھی۔ ایسا نہیں تھا کہ اب شاہ فضل کا رویہ اس کے ساتھ بہت اچھا تھا۔ تبدیلی صرف خیالات میں آئی تھی رویوں میں نہیں۔ وہ اس کشمکش اور جھنجلاہٹ کو چھا نہیں سکا تھا۔

اور اسی شام جب اس نے اپنے کپڑے استری نہ ہونے پر اسے بلند آوازی میں گالی دی تھی اور اسے تھپڑ مارا تھا تو وہ کیسے پتھرائی ہوئی نظروں سے اسے دیکھتی رہی تھی اور اس پل شاہ فضل کو بے حد خوف محسوس ہوا تھا اس کے صبر سے۔ اس کی ان بے تاثر نگاہوں سے۔

رات کے کھانے کے برتن سمیٹتے ہوئے ندرت نے ہمدردی دکھانے کی کوشش کی تھی مگر اربیحہ نے اسے وہیں ٹوک دیا۔

''اللہ آپ کو بڑا اجر دے گا اس صبر کا بی بی!'' وہ خوشی سے اسے دیکھتی رہی۔

''نہیں۔ تم غلط کہہ رہی ہو ندرت! یہ صبر میں اپنی خوشی سے نہیں کر رہی، یہ میری مجبوری ہے اور اس کا کوئی اجر نہیں'' اس کا لہجہ کرب میں ڈوبا ہوا تھا، مگر بہت ٹھہراؤ آ گیا تھا اس میں۔

باہر کھڑے شاہ فضل کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں بھینچ لیا تھا۔ وہ لب کچلتا واپس پلٹ گیا تھا۔

☆☆☆

ٹوٹے خوابوں کی کرچیاں
دل کے نازک خانوں میں چبھتی رہیں
سورج اندھے کنویں میں
پڑا روتا رہا
پھول خاک میں اٹے رہے
رنگوں کا حسین قافلہ
دل دہاڑے لٹتا رہا
شہر آرزو پہ خون
دھبوں کی صورت بکھرتا رہا

وہ بڑی دیر سے کارپٹ پر لیٹی ہوئی تھی۔ سر کے نیچے کشن دھرے، بنا کسی کمبل، کسی چادر کے، ایک بازو آنکھوں پہ دھرے، اس کی آنکھوں سے مسلسل سیل رواں بہہ رہا تھا۔

آج صبح سے ہی اس کی طبیعت کچھ اپ سیٹ سی تھی۔ کچن میں کام کرتے ہوئے بار بار اس کی آنکھوں کے گرد اندھیرا چھا رہا تھا۔ سر جھٹک کر خود کو سنبھالنے کی بارہا کوشش کرتی رہی، آخر چکرا کر گر پڑی، بی بی جان کو پتا چلا تو انہوں نے گاؤں کے ہسپتال سے ڈاکٹر کو بلا لیا۔ انہوں نے ابتدائی چیک اپ کے بعد بی بی جان کو بتایا تھا۔

''شی از پریگنٹ'' اربیحہ کا رنگ فق ہو گیا۔

''میرا مطلب ہے یہ امید سے ہے اور میرا خیال ہے یہ اس کی فرسٹ پریگنینسی ہے۔ خیر آپ اس کا خیال رکھیں بلکہ اس کے شوہر کو بلائیں، یہ کافی کمزور ہے۔ اگر اس کی ڈائٹ پر مکمل توجہ نہ دی گئی تو مر بھی سکتی ہے۔'' ڈاکٹر ثمرین نے تفصیل سے انہیں بتایا۔

بی بی جان ہکا بکا سی بیٹھی تھیں۔

اربیحہ گم صم سی پھٹی پھٹی آنکھوں کے ساتھ انہیں دیکھ رہی تھی۔ ڈاکٹر ثمرین کو اس پر پیار آ گیا۔ انہوں نے اس کا گال تھپ تھپایا۔

''کم آن لٹل گرل! ناؤ چیر اپ، شوہر کہاں ہے تمہارا، میں اسی سے بات کروں گی، بی بی جان! یہ مجھے آپ کی ملازمہ لگتی ہے؟'' ڈاکٹر ثمرین نے اس کے حلیے سے بالکل ٹھیک ہی قیاس کیا تھا۔

''ان کے میاں ادھر نہیں ہیں جی'' ندرت نے جلدی سے کہا۔

ڈاکٹر کے جانے کے بعد وہ اربیحہ کے پاس آ بیٹھیں، مگر وہ ایک جھٹکے سے اٹھی اور باہر نکل گئی۔ بی بی جان! ششدر سی اسے جاتا دیکھتی رہیں پھر ندرت کو اس کے پیچھے جانے کا اشارہ کیا۔ ندرت اس کے کمرے میں داخل ہوئی تو وہ آئینے کے سامنے کھڑی تھی۔

''اربیحہ بی بی! آپ خوش نہیں ہیں؟'' ندرت نے پوچھا تو وہ چونک کر مڑی۔

''خوش کیسے ہوتے ہیں، یہ بھول چکی ہوں'' وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔

''آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں بی بی!'' ندرت نے حیران ہو کر کہا۔

وہ ایک دم جیسے ہوش میں آ گئی۔ چند لمحے ہراساں نظروں سے اسے دیکھتی رہی، پھر بے ساختہ اس کے شانے سے لگ کر بلند آواز میں رونے لگی۔

''مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے ندرت! میں کیا کروں؟ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا شاہ سائیں تو میرے ٹکڑے کر دیں گے'' وہ ہذیانی انداز میں بول رہی تھی۔

''کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ شاہ سائیں تو خوش ہوں گے'' ندرت نے حیرانی سے کہا۔

''وہ خوش نہیں ہوں گے۔ اولاد صرف خاندانی عورت سے پیدا کی جاتی ہے اور میں.....؟ یہ تو تم بھی جانتی ہو نا ندرت! کہ خون بہا میں آنے والی عورتوں کو صرف گھروں میں جگہ دی جاتی ہے، ان سے اولاد پیدا نہیں کی جاتی۔'' وہ پھنکار رہی تھی۔

''انہوں نے آپ کو بیوی کا درجہ دیا ہے تو اولاد ہوئی ہے نا'' ندرت نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

''اپنی ضرورت کے تحت'' وہ تلخی سے بولی۔ ندرت خاموشی سے واپس پلٹ گئی۔

اس وقت سے لے کر اب تک وہ مسلسل اس کمرے میں بند تھی۔ آنسو تھے کہ تھمنے میں نہ آ رہے تھے دروازہ کھلا اور کوئی اندر آ گیا اس کے ساتھ ہی خوشبو کا ایک جھونکا سا پھیل گیا۔ دروازہ بند ہوا اور قدموں کی چاپ صوفہ کے قریب جا کر رک گئی۔ وہ سر اٹھائے بغیر بھی جانتی تھی کہ وہ شاہ فضل تھا، وہ اسی طرح بے حس و حرکت پڑی رہی۔ یہ جانے بغیر کہ مقابل نے اس کی بھنچی ہوئی مٹھیوں کو فوراً نوٹ کیا تھا۔

''اربیحہ!'' اس نے پکارا۔

وہ اسی طرح پڑی رہی۔ وہ آہستگی سے اٹھا اور چلتا ہوا اس کے قریب آ کر گھٹنوں کے بل جھک کر بیٹھ گیا، پھر اس کے چہرے سے بازو ہٹا دیا۔ وہ اٹھ بیٹھی۔

''یہ کیا حالت بنائی ہوئی ہے تم نے؟'' اس کا لہجہ سخت ہوا تھا۔ اربیحہ کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا، آنکھیں بھی شدت گریہ سے سرخ تھیں اور ہونٹ سوجے ہوئے تھے۔ وہ خاموشی سے ہونٹ کاٹتی رہی۔

''کیا پوچھ رہا ہوں میں؟'' اس نے سختی سے اس کا شانہ جھنجوڑا۔ اس کی آنکھیں چھلک اٹھیں۔

''ایسا تو نہیں ہو سکتا کہ آپ کے علم میں نہ ہو، یوں انجان بننے کا مقصد؟'' اس کی آواز بلند نہیں تھی مگر لہجہ ضرور حیران کن تھا۔ وہ حیران ہوا۔

''مجھے اپنا بچہ چاہیے'' اس نے ایک ہی جملے میں باور کروا دیا تھا کہ وہ اتنا بے خبر نہیں تھا۔

''مگر مجھے نہیں چاہیے'' وہ سارے خدشات، سارے خوف بالائے طاق رکھتے ہوئے پھٹ پڑی۔

وہ دنگ رہ گیا، مگر اگلے لمحے اس کا ہاتھ اٹھا اور پوری قوت سے اربیجہ کے بائیں گال پر پڑا۔

''بکواس بند کرو۔ تم سے تمہاری مرضی کون پوچھ رہا ہے؟'' وہ اس کے بال مٹھی میں جکڑے غرایا۔

اتنا عرصہ دل میں دبا لاوا پھٹ پڑا، غم و غصے کی کیفیت سے پاگل سی ہوگئی۔ اس نے بے اختیار شاہ فضل کی قمیض کا کالر دونوں ہاتھوں سے دبوچ لیا۔

''بچے کی بات تو بعد میں آئے گی۔ پہلے میری حیثیت کا تعین تو کر دیں کیا ہوں میں آپ کے نزدیک جس کی ماں کا درجہ اب تک متعین نہیں ہو سکا، اس کی اولاد کی کیا حیثیت ہوگی۔ بیٹا ہوگا تو آپ جیسا جو عورت کو ذلیل حقیر چیز سمجھے گا اور بیٹی ہوگی تو میرے جیسی جو دن بھر مشقت کی چکی میں پسے گی اور رات کے خوف سے اپنے مرنے کی دعائیں مانگے گی۔ نہیں چاہیے مجھے ایسی اولاد۔ اس سے بہتر تو یہ ہے کہ آپ میرے ٹکڑے کر دیں۔ مار ڈالیں مجھے۔ جان لے لیں میری.....''

وہ بولتے بولتے ہانپ گئی اور بے دم ہو کر اس کے بازوؤں میں جھول گئی۔ وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔

☆☆☆

میری گواہی آدھی ہے تو
میرا جرم بھی آدھا ہوگا
میرا حصہ آدھا ہے تو
میری سزا بھی آدھی ہوگی

دوبارہ اس کی آنکھ کھلی تو کمرے میں نیلگوں روشنی پھیلی ہوئی تھی اور وہ کارپٹ کے بجائے بیڈ پر تھی۔

اس نے کروٹ لی تو دیکھا فضل شاہ، اس کے بالکل ساتھ ہی نیم دراز تھا اس کے ہاتھوں میں سلگتا ہوا سگریٹ تھا وہ اس کی طرف مطلق متوجہ نہ تھا خاموشی سے سامنے دیوار پر

نظریں جمائے دھواں اڑا رہا تھا۔

''تمہاری ساری باتیں ٹھیک ہیں اربیجہ!'' اس کی مدھم مگر بھاری آواز اربیجہ کو ساکت کر گئی۔

''بابا سائیں کا کہنا ہے کہ مجھے باقاعدہ طور پر ایک بڑا سا ولیمہ دینا چاہیے تاکہ سب جان لیں کہ تم شاہ فضل کی بیوی ہو''

اربیجہ حق دق سی اسے دیکھ رہی تھی۔

''تم حویلی کا وارث پیدا کرنے جا رہی ہو اور یہ کوئی معمولی بات تو نہیں ہے'' وہ کہہ رہا تھا۔

''سنو! مجھے بیٹا چاہیے'' اس کی تحکمانہ سرگوشی گونجی تھی۔

اربیجہ کے دل میں ٹھک سے ایک تیر پیوست ہوا تھا۔

''تو گویا یہ مہربانی اور نوازش بیٹے کے لیے ہے''

☆☆☆

اگلی صبح بہت سی تبدیلیاں لے کر آئی تھی۔

اربیجہ نے حیرت سے اپنے سامنے پڑی خوش رنگ غذاؤں اور پھلوں کے ڈھیر کو دیکھا۔

''بی بی جان! مجھے کچھ نہیں کھانا۔ اللہ کے واسطے مجھے مجبور نہ کریں'' وہ از حد اذیت سے بولی۔

بی بی جان نے اس کے زرد یاں کھنڈے چہرے کو دیکھا۔

''ایسا نہ کرو بیٹی! پہلے میں مجبور تھی۔ تم نے فضل کا غصہ نہیں دیکھا، ہم نے دیکھا۔ وہ تو شاید تمہیں اسی دن قتل کر ڈالتا، جب لے کر آیا تھا (نکاح کے دن) مگر یہ تو اس کے بابا کا کمال تھا کہ انہوں نے اسے لاہور بھیج دیا سمجھا بجھا کر بلکہ زبردستی کر کے تاکہ اس کا غصہ تھوڑا ٹھنڈا ہو جائے اب وہ نرم ہوا ہے تو تم کیوں خود کو مصیبت میں ڈالنا چاہتی ہو؟'' وہ اسے پیار سے سمجھانے لگیں۔

اربیجہ کو پورے سیاق و سباق کے ساتھ وہ پہلی رات یاد آئی جب ایک مرد نے جو کہنے کو اس کا شوہر تھا، جی بھر کے اس کے وجود کو اپنی درندگی کا نشانہ بنایا تھا اور جو کہنے کو اس کی سہاگ رات تھی آج بھی اس وقت کی یاد اربیجہ کو لرزا گئی۔

''بی بی جان! مجھے عادت نہیں رہی۔ کیوں آپ میرے ساتھ زبردستی کر رہی ہیں میں نہیں کھا سکوں گی سب الٹ دوں گی، فائدہ''

''اپنا نہیں تو اپنے ساتھ جڑی اس دوسری جان کا ہی کچھ خیال کرلو'' وہ اسے احساس دلانے لگیں۔

اربیجہ نے اذیت سے لب کچلے اور بڑی مشکل سے اپنے آنسوؤں پر قابو پا کر انہیں دیکھا۔

''بی بی جان! اگر بیٹی ہوئی تو پھر.....؟''

بی بی جان کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔

''ایسا نہ کہو اچھی بات منہ سے نکالو''

''مجھے یہ سب آسائشات اس لیے دی جا رہی ہیں کہ میں اس حویلی کا وارث پیدا کرنے والی ہوں اور اگر ایسا نہ ہوا تو پھر میری اس حویلی میں کیا حیثیت ہوگی ایک پھٹے پرانے ورق جیسی۔ اسی لیے میں کہہ رہی ہوں مجھے ان عیاشیوں کا عادی نہ بنائیں''

انہیں حیرت ہوئی۔ وہ تو اسے نادان سمجھتی تھیں مگر اس نے تو بہت دور کی سوچی تھی۔

''مگر یہ تمہارے لیے ضروری ہے'' وہ جیسے عاجز سی ہو کر بولی تھیں۔

''ضروری نہیں ہے بی بی جان! بہت سی عورتیں اس حالت میں ہوتی ہیں تو سارے کام بھی کرتی ہیں۔ محنت مزدوری بھی کرتی ہیں انہیں بھی تو دو وقت کا کھانا بمشکل نصیب ہوتا ہے۔ وہ کیوں ضرورت محسوس نہیں کرتیں ان سب چیزوں کو، کیونکہ وہ عادی نہیں ہوتی۔ میں بھی نہیں ہوں'' وہ سفاکی سے اپنا تجزیہ کر رہی تھی۔

بی بی جان خفا سی ہو کر اٹھ گئیں اور جا کر شاہ فضل کو بھیج دیا تھا۔ وہ جو مردانے میں بہت ضروری امور پر گفتگو کر رہا تھا، اس بے جا مداخلت پر دندناتا ہوا اندر آیا۔

''کیا مسئلہ ہے تمہارے ساتھ؟ کیوں نہیں مان رہیں تم بی بی جان کی باتیں؟'' وہ اس کا بازو دبوچتے ہوئے غرایا۔

وہ آنسو جو اربیجہ نے بمشکل روکے ہوئے تھے، شدتوں سے بہہ نکلے۔

''میں نہیں کھا سکتی یہ سب، مجھے عادت نہیں رہی۔ مجھے تو ان چیزوں کا ذائقہ بھی بھول گیا ہے۔ شاہ سائیں! آپ بی بی جان سے کہیں کہ وہ مجھے مجبور نہ کریں'' وہ شدتوں سے

رو پڑی تھی۔

وہ ایک جھٹکے سے اس کا بازو چھوڑ کر واپس مڑ گیا، جاتے جاتے بی بی جان سے کہہ گیا۔

''آپ اسے مجبور نہ کریں۔ جب اس کا دل چاہے گا کھا لے گی'' وہ سپاٹ لہجے میں کہتا واپس مردان خانے کی طرف بڑھ گیا۔

اربیجہ سوچوں میں گم تھی۔ نئی زندگی کی خبر نے اس میں کوئی امنگ بیدار نہیں کی تھی۔ آج اسے منصور لالہ بہت یاد آ رہے تھے'' کاش! وہ یہ سب نہ کرتے، انہوں نے ایسا کیوں کیا؟ وہ تو اس سے بہت محبت کرتے تھے۔ انہوں نے ایک بار بھی پیچھے رہ جانے والوں کے لیے نہ سوچا'' کمرے میں بی بی جان کی اچانک آمد سے وہ چونک اٹھی۔ اس نے سنبھل کر بیٹھتے ہوئے بی بی کے لیے بیڈ پر جگہ بنائی۔ اس نے دیکھا، ان کے ایک ہاتھ میں تسبیح جبکہ دوسرے ہاتھ میں موبائل تھا۔ وہ بیڈ پر ٹکتے ہوئے بولیں۔

''تم بہت صبر والی ہو میری بچی! بہت حوصلہ ہے تم میں..... اپنی ماں سے بات کرلو، وہ تمہارے لیے بہت پریشان ہے''

اربیجہ نے تڑپ کر ان کی طرف دیکھا ان کی آنکھوں میں اس کے لیے بہت پیار تھا۔ وہ اسی شفقت آمیز لہجے میں گویا ہوئیں۔

''تمہاری ماں کا فون آیا تھا..... بہت رو رہی تھی۔ وہ ابھی دوبارہ فون کرے گی..... تم اس سے بات کرلینا۔''

انہوں نے ہاتھ میں پکڑا موبائل اس کے پاس ہی بیڈ پر رکھ دیا اور کھڑی ہو گئیں اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور کمرے سے باہر چلی گئیں۔ وہ موبائل دیکھنے لگی۔ اچانک موبائل بج اٹھا۔ وہ بجتے ہوئے موبائل کو خالی خالی نظروں سے تکنے لگی۔ اسے موبائل کی گھنٹی کی آواز میں ایک تڑپ محسوس ہوئی۔ اسے لگا جیسے یہ موبائل کی گھنٹی نہیں، اس کی ماں کی پکار ہے جو اس کے لیے تڑپ رہی ہے۔ ماں کے بلکتے ہوئے چہرے کا خیال آتے ہی اس نے فوراً موبائل اٹھا لیا۔

''ہیلو!'' اس کی آواز بہ مشکل نکلی۔

''اربیجہ! میری گڑیا! کیسی ہو؟''

دوسری طرف کی آواز سن کر وہ تڑپ اٹھی۔

''منصور لالہ! آ.....آپ.....آپ کیسے ہیں؟ کہاں ہیں؟ دیکھیں، آپ کی گڑیا کے ساتھ کیا ہو گیا'' وہ بری طرح بلک اٹھی۔

''اربیحہ، میر گڑیا! میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کا خمیازہ تمہیں بھگتنا پڑ سکتا ہے میں نے سوچا تھا کچھ دنوں بعد جب یہ معاملہ ٹھنڈا پڑ جائے گا تو میں واپس آ کر بتاؤں گا کہ اس کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے۔ میری گڑیا! میں بے گناہ ہوں..... میرا یقین کرو..... میں نے قتل نہیں کیا۔ میں اپنے دوست کو کیسے قتل کر سکتا ہوں..... لیکن اب مزید نہیں..... اب میں تمہاری زندگی برباد ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ میں کچھ دن علاقہ غیر میں رہا، پھر کینیڈا چلا گیا تھا اور اب واپس آ رہا ہوں'' منصور ملک کی آواز میں آنسوؤں کی نمی، مگر لہجہ بہت ٹھوس تھا۔

منصور کی بات سنتے ہی وہ تڑپ اٹھی۔

''نہیں لالہ نہیں..... میرے ساتھ تو جو ہونا تھا..... ہو چکا..... اب آپ واپس نہ آئیں..... فضل شاہ آپ کو زندہ نہیں چھوڑے گا..... میرے ساتھ جو ہوا، میں نے برداشت کر لیا، لیکن آپ کو کچھ ہو، یہ میں برداشت نہیں کر پاؤں گی۔ میں اپنی جان دے دوں گی لالہ! میں نے یہ سارے ستم اس لیے برداشت کیے کہ آپ سلامت رہیں۔ اب آپ ایسا کچھ نہیں کریں گے، جس سے..... آپ میری زندگی چاہتے ہیں تو ایسا سوچیں بھی نہیں۔ مجھ سے وعدہ کریں۔ آپ ایسا نہیں کریں گے۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ منصور ملک کا دل کٹ کٹ کر ٹکڑے ہو گیا تھا۔

بہن کی اس محبت نے اسے مزید پشیمانیوں کے سمندر میں دھکیل دیا تھا۔ کاش وہ ہمت سے کام لیتا، پولیس کے سامنے پیش ہوتا تو یوں اس کی بہن قربان نہ ہوتی۔ اس نے یہ کب چاہا تھا۔ جرم بے گناہی کی سزا وہ خود بھی بھگت رہا تھا اور اس کی بہن بھی۔

اربیحہ فون بند کر کے دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر بلک اٹھی۔ ایک طرف یہ خوشی کہ بھائی زندہ سلامت تھا تو دوسری طرف یہ دکھ اسے کاٹ رہا تھا کہ وہ اپنے پیارے بھائی کو دیکھ بھی نہیں سکتی تھی۔

☆☆☆

یہ راکھ راکھ رتیں، اپنی رات کی قسمت
تم اپنی نیند بچھاؤ، تم اپنے خواب چنو!
بکھرتی ڈوبتی نبضوں پہ دھیان کیا دینا
تم اپنے دل میں دھڑکتے ہوئے حروف سنو!!

ایک شان دار جشن تھا، ایک شان دار رات تھی حویلی کا بڑا سالان لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ گڑیا کی طرح سجی اسٹیج پر جلوہ افروز تھی۔ تقریب رات گئے تک جاری رہی تھی۔ اختتام پر ندرت اسے شاہ فضل کے کمرہ میں چھوڑ گئی تھی۔

دل متضاد کیفیات کا شکار ہو رہا تھا۔ شاہ فضل نے اسے بیوی کا درجہ دے دیا تھا لیکن یہ اس کی وہی روایتی جاگیردارانہ سوچ کا نتیجہ تھا۔

وہ کس طرح یہ برداشت کر سکتا تھا کہ اس کا بچہ کسی ایسی عورت سے جنم لے جسے اس نے اپنے ملازمین سے بھی بدتر درجہ دیا ہوا تھا۔ اس کے لیے تو ضروری تھا کہ اس کی حیثیت مستند ہوتی۔ اس کی بیوی کو سارا گاؤں جان لیتا، جس کے لیے وہ ولیمہ ناگزیر تھا۔

وہ جانتی تھی کہ یہ سب آسائشات صرف بچہ کی پیدائش تک تھیں، اسی لیے وہ انہیں قبول کرنے، اپنانے اور ان کا عادی ہونے سے ہچکچا رہی تھی اور تب زور سے مٹھیاں بھینچتے ہوئے اس نے ایک فیصلہ کر لیا۔

دروازہ کھلنے کی آواز پر بھی وہ اسی طرح بیٹھی رہی۔ وہ اندر آیا اور واش روم کی سمت بڑھ گیا۔ کچھ دیر بعد وہ واپس آیا اور بولا۔

''اربیحہ! اس بھاری لباس میں کیسے سو پاؤ گی؟ وہ نرم ہاتھ سے اس کا گال تھپک رہا تھا۔

وہ خاموشی سے اٹھ گئی۔ زیورات اتارے، میک اپ صاف کیا۔ نائٹی نکالی اور واش روم کی سمت بڑھ گئی جب وہ لوٹی، وہ فون پر کسی سے محو گفتگو تھا۔

''عباس! میں نہیں آ سکتا، اتنی ایمرجنسی میں۔ بات کیا ہے'' وہ خاصا جھلایا ہوا تھا۔ اچانک اس کا چہرہ یک دم تن سا گیا۔

''ہاں، میرے پاس ہی ہے۔ ہاں دونوں چیزیں۔'' اس کے چہرے پر عجیب سا کرب چھلکا تھا۔

''صبح نکلتا ہوں آنے کے لیے۔ابھی تو بالکل نہیں بہت تھکا ہوا ہوں۔''اس نے کہا۔

پھر فون بند کر کے اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''یہاں آؤ۔''اس نے معمول کا حکم دیا تھا۔

اربیجہ خاموشی سے چلتی اس کے بعد برابر آن بیٹھی، اس نے ہاتھ بڑھا کر اربیجہ کو تھام لیا۔

''مجھے.....آپ سے کچھ.....بات کرنا ہے۔''اربیجہ نے اس کی جنونی پیش قدمی پر بند باندھنا چاہا۔ جواباً شاہ فضل نے اسے جن نظروں سے دیکھا، اس کا دل چاہا ڈوب کر مر جائے۔اس نے بے ساختہ آنکھیں میچ لیں۔دو بے تاب آنسو فوراً چھلک اٹھے تھے۔

کبھی دیکھ غور سے دیکھ
میر آنسوؤں پر بھی نیل ہیں
انہیں کس نے مارا ہے سوچ تو!
کبھی سن سکوت کی سسکیاں!

☆☆☆

اگلے دن وہ لاہور روانہ ہو گیا، اربیجہ نے اسے کافی پریشان اور الجھا ہوا دیکھا تھا مگر پوچھنے کی ہمت نہ پڑی تھی۔وہ اس وقت پولیس اسٹیشن میں موجود تھا۔ایس پی عباس نے بغور اس کے بارعب اور وجیہہ چہرے کا جائزہ لیا اور قدرے آگے کو جھک آیا۔

''کیا آپ کو یقین ہے کہ یہ قتل منصور ملک نے کیا ہے؟''اس نے سرسراتے لہجے میں پوچھا۔شاہ فضل نے ناگواری سے عباس کو دیکھا اور قدرے اشتعال سے کہا۔

''ثبوت تمہارے سامنے پڑے ہیں، کس بات پر شک ہے تمہیں؟ اس نے ٹیبل پر پڑے منصور ملک کے ریوالور اور پوسٹ مارٹم سے ملنے والی اس اکلوتی گولی کی طرف اشارہ کیا۔

عباس نے زور سے ٹیبل پر ہاتھ مارا۔

''یہی تو، یہی تو بنیادی غلطی ہے ہماری۔ہم اندھا دھند مجرم کو ڈھونڈنے میں لگے ہیں، مگر اس بات پر غور کرنے کی قطعی زحمت نہیں کی کہ وہ مجرم ہے بھی یا نہیں۔دیکھیں۔روسی ساختہ بریٹا ہے جبکہ پوسٹ مارٹم کے بعد ملنے والی گولی اعشاریہ بتیس بور کی ہے۔''

انہوں نے پریقین لہجے میں کہا۔

شاہ فضل کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

''پولیس سے زیادہ اسلحہ کی پہچان کسی اور کو نہیں ہوتی۔قتل منصور نے نہیں کیا بلکہ اس ریوالور میں تو کوئی گولی تھی ہی نہیں۔اگر منصور ملک، شاہ فیصل کو مارنا چاہتا تھا تو پھر وہ یہ خراب پسٹل وہاں کیوں لے کر آیا تھا؟''خراب.....؟''شاہ فضل کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

''جی خراب یہ دیکھیں یہ صحیح کام نہیں کر رہا ہے۔یہ دیکھیں اس کا ٹرائیگر کام نہیں کرتا۔''اس نے چلا کر دکھایا اور بات آگے بڑھائی۔

''اگر منصور ملک نے یہ قتل کیا بھی ہے تو وہ یہ خالی ریوالور وہاں کیوں پھینک گیا، جس پر اس کے فنگر پرنٹس بھی تھے جبکہ مجرم پہلے اپنے فرار کا راستہ دیکھتا ہے، پھر جرم کرتا ہے۔کیا وہ اتنا احمق تھا کہ اپنا لائسنس یافتہ ریوالور وہاں پھینک کر چلا گیا۔اور آخری بات! پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق گولی تقریباً تیس گز کی دوری سے چلائی گی تھی لیکن اس کچی زمین سے صرف ان پیروں کے نشان ملے جیسے دو شخص آپس میں کھڑے باتیں کر رہے ہوں ہو سکتا ہے بات اس ریوالور کے حوالے سے ہی کر رہے ہوں اور اسی دوران گولی اور طرف سے چلائی ہو۔منصور خوف زدہ ہو گیا اور بدحواسی میں ریوالور وہیں پھینک کر بھاگ گیا اور یوں ہم مسلسل دو تین ماہ سے ایک غلط شخص کی تلاش میں پاگل ہو رہے ہیں جبکہ اصل مجرم آزاد پھر رہا ہے۔''عباس اپنی بات مکمل کر کے خاموش ہو گیا۔

شاہ فضل پھیکا چہرہ لیے بیٹھا تھا۔اس کی بے یقین نظریں عباس پر جمی تھیں۔

''آپ کی کسی سے کوئی ذاتی رنجش؟ کوئی کسی قسم کی معمولی جھڑپ؟ کچھ بھی؟''عباس نے سوا کیا۔

شاہ فضل نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''پھر بھی آپ اس پر غور ضرور کریں شاہ صاحب! ممکن ہے کہ کسی نے اپنی خفیہ دشمنی نکالی ہو۔''

تب ہی اس کا ڈرائیور نثار ایک کانسٹیبل کے ساتھ اندر آ گیا۔

سائیں! آپ سے بات کرنا ہے۔''

''بولو نثار!''وہ خود کو سنبھال کر بولا۔لہجے کا طنطنہ قدرے دھیما پڑا ہوا تھا۔

''سائیں! حویلی سے فون آیا ہے بڑے سائیں کا۔''اس نے بتایا۔

''کوئی خاص بات؟'' وہ چونکا۔

''وہ آپ سے بات کرنا چاہ رہے تھے مگر آپ کا فون شاید بند ہے''

''ہاں، ٹھیک ہے تم جاؤ میں کرلوں گا'' فضل نے اسے جانے کا کہا۔

کمرے میں ایک بار پھر ہولناک اور پراسرار خاموشی چھا گئی۔

''یہ کیسے ممکن ہے؟''

''شاہ فضل نے بڑبڑاتے ہوئے اپنی کنپٹی کو مسلا۔ اس کے چہرے پر شدید پریشانی کے آثار نمایاں تھے۔ آنکھوں کی سرخی دم بہ دم گہری ہوتی جارہی تھی۔ یہ احساس کتنا اذیت ناک تھا کہ وہ غلطی پر تھا اور اربیجہ بے قصور تھی۔ اسے اربیجہ کا خیال آ گیا۔

''ساری تفصیل میں آپ کے گوش گزار کر چکا ہوں شاہ صاحب! آپ پلیز محتاط رہیے'' عباس نے اس کی پریشانی دیکھ کر مخلصانہ مشورہ دیا۔

شاہ فضل نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ کچھ دیر نہ سمجھنے والے انداز میں اس کا چہرہ دیکھتا رہا، پھر تھک کر سر کرسی کی پشت سے ٹکا دیا۔

''کافی منگواؤں آپ کے لیے؟'' عباس نے پوچھا، پھر اس کے سر ہلانے پر انٹرکام اٹھا کر کافی کا آرڈر دینے لگا۔

☆☆☆

''اس کو کیا لگتا ہے وہ اتنی جلدی مجھ تک پہنچ جائے گا؟ ہونہ! یہ اس کی بھول ہے قیامت کے دن شاہ فیصل بھی نہیں بتا سکے گا کہ اسے کس نے قتل کیا تھا''

وہ حقارت سے کہتے ہوئے ہنسا۔ چند لمحے دوسری طرف فون پر مخاطب عورت کی آواز سنتا رہا، پھر بھڑک اٹھا۔

''بس کردے تو۔ تو اور تیرے ڈراوے۔ بھر بیٹھا میں ان سے۔ اللہ بس مجھے ہی دیکھ رہا ہے کیا؟ ان وڈیروں کو نہیں؟ ان کی رسیاں کیوں دراز ہیں؟'' وہ تنفر سے کہہ رہا تھا۔

''اوہ رہنے دے۔ اربیجہ بی بی کی آہ لگ جائے گی۔'' اس نے منہ بگاڑ کر نقل اتاری۔

''مجھے نہیں لگتی کی کی آہ واہ، اور اس پر کون سا ظلم کے پہاڑ توڑے جارہے ہیں۔ کون سے پتھر توڑنے پڑ رہے ہیں اسے؟ فضل بابو کی زال (بیوی) ہے، وہ جس کا ولیمہ کھایا ہے پورے گاؤں نے کیا تکلیف ہے اسے وہاں؟'' اس کی تنگ پیشانی شکنوں سے پر تھی۔

''چل بس کر مجھے نہیں چاہیے تیرا بھاشن۔ شادی کرالوں ایک بار تجھ سے، پھر بتاؤں گا۔'' اس نے فون بند کرتے ہوئے دھمکی آمیز انداز میں کہا۔ چند لمحے کھڑا کچھ سوچتا رہا پھر سر جھٹک کر بی ایم ڈبلیو کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

کافی کے مگ سے اٹھتی بھاپ فضا میں عجیب عجیب سے ہیولے بناتی اڑ رہی تھی۔

ایس پی عباس نے شاہ فضل کا چہرہ جانچا پھر بالکل سپاٹ پا کر نظر پھیر لی۔

''آپ کو کسی پہ شک ہے؟'' عباس نے قدر آگے کو جھکتے ہوئے کہا۔

''یقین سے کہا نہیں جاسکتا۔ چھوٹے موٹے جھگڑے تو چلتے ہی رہتے ہیں مگر وہ بہت نچلے درجے کے لوگ ہیں۔ اتنا بڑا قدم نہیں اٹھا سکتے۔ یہ یقیناً کسی منجھے ہوئے کھلاڑی کا کام ہے، جس نے سچوایشن کو اتنی مہارت سے استعمال کیا کہ ہم مسلسل دو ماہ سے بے وقوف بن رہے ہیں'' اس نے تفصیل سے بتایا۔

عباس نے دیکھا بولتے ہوئے اس کے لہجے میں ایک خالی پن اور آنکھوں میں سکوت طاری تھا۔

''کیا آپ کے ذہن میں ایک بھی نام نہیں؟'' عباس الجھا۔

شاہ فضل نے لب بھینچتے ہوئے سر نفی میں ہلا دیا۔

''پھر اس کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ آپ اپنی سکیورٹی بڑھا لیجیے۔ یہ خفیہ دشمن آپ کو بھی نقصان پہنچا سکتا ہے۔ اس صورت میں تو خطرہ مزید بڑھ جائے گا جبکہ ہم اس کا مقصد نہیں جانتے، نہ ہمیں اس کی ڈیمانڈ کا اندازہ ہے، نہ اس کے ٹارگٹ کا۔''

وہ سر ہلا کے اٹھ گیا۔

''ایک آخری بات شاہ صاحب! اپنے اردگرد خصوصی نظر رکھیے، تاریخ گواہ ہے، پیٹھ میں چھرا گھونپنے والے اکثر اپنے ہی ہوتے ہیں۔ ہوسکتا ہے آپ کے ساتھ بھی کوئی ایسی کالی بھیڑ ہو جو بھیڑ کی کھال میں بھیڑیا ہو۔''

عباس کے لہجے سے حقیقی فکرمندی جھلک رہی تھی۔

''مجھے اعتراف ہے عباس! اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ جو لیس سیزر کو قتل کرنے کے لیے اٹھنے والا سب سے پہلا ہاتھ اس کے سب سے عزیز ترین دوست بروٹس کا ہی تھا۔'' وہ ہلکے

سے مسکرایا اگرچہ اس کی مسکراہٹ بہت پھیکی تھی۔ اور باہر نکل گیا۔

نثار نے اسے دیکھ کر ادب سے گاڑی کا دروازہ کھولا اور اس کے بیٹھتے ہی گاڑی تیزی سے چل پڑی۔

''کہاں چلوں سائیں؟'' اس نے گردموڑ کر پوچھا۔

''ماڈل ٹاؤن چلو'' اس نے لاہور میں موجود اپنے گھر کا کہا۔

''حویلی نہیں جائیں گے؟''

''اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔''

''کچھ پتا چلا سائیں؟'' اس کے لہجے میں تجسس اور کھوج تھا۔

''نہیں'' اس نے ایک لفظی جواب دیا۔

''آپ فکر مت کریں سائیں! رب تعالیٰ نے چاہا تو مجرم ایک دن شرمناک انجام سے دوچار ہوگا۔ فیصل سائیں کا خون رائیگاں نہیں جائے گا'' اس نے خلوص سے کہا۔

اس پل وہ نہیں جانتا تھا کہ بعض دعائیں کتنی جلدی مستجاب ہوتی ہیں۔

☆☆☆

''تم فیصلے کا اختیار اپنے ہاتھ میں مت لو فضل! تم عدل کا ترازو رب کے پاس رہنے دو۔ تم جزا و سزا کا فیصلہ نہیں کر سکتے''

اسے یاد تھا یہ الفاظ اسے بی بی جان نے تب کہے تھے، جس دن وہ اربیجہ کو نکاح کر کے لایا تھا۔

اس کی مٹھیاں بھینچ گئیں اور آنکھوں میں دھند سی اترنے لگی۔

''کیا کر لیا ہے میں نے اپنے ساتھ؟؟؟ کیا ہو گیا ہے مجھ سے؟''

اس نے بے بسی سے اپنے بال نوچ ڈالے۔

اس کے اندر کوئی بہت زور سے اس پر ہنسا۔

''تم اپنے آپ کو فرعون سمجھ بیٹھے تھے شاہ فضل! تمہیں ہمیشہ سے یہی لگتا ہے کہ تم درست ہو، تمہارے سارے فیصلے درست ہیں اور باقی ساری دنیا غلط۔ کیا جواز تھا تمہارے پاس اربیجہ سے کیے جانے والے اس غیر انسانی سلوک کا؟ صرف یہ کہ وہ تمہارے بھائی کے قاتل کی بہن تھی۔ یہی اس کا جرم تھا، یہی اس کی خطا اور یہی اس کا گناہ؟ تمہیں ایک پل خیال نہیں آیا کہ

وہ معصوم لڑکی بے گناہ ہے۔ ذرا سوچو! تم نے کبھی اس کو لڑکی سمجھ کر بھی اس سے نرمی اختیار نہ کی، اسے بیوی سمجھ کر پیار نہ کیا بلکہ تم نے تو اسے انسان سمجھ کر بھی اس پر ترس نہ کھایا'' ضمیر کی عدالت بے رحمی سے اس کا محاسبہ کر رہی تھی۔

اس نے پاگل ہوتے ہوئے کرسٹل کا گلدان آئینے پہ دے مارا۔ اس کا عکس کئی ٹکڑوں میں بٹ گیا بالکل ویسے جیسے اس کی شخصیت، اس کی انا، اس کا وقار، اس کا غرور اور اس کی رعونیت کے ریزے ریزے ہو گئے تھے۔

☆☆☆

عجب صورت حال ہوتی جا رہی ہے
رات کے بعد رات ہوتی جا رہی ہے
وہ تو آج بھی مکمل ہے پتھر کی طرح!
ریزہ ریزہ تو میری ذات ہوتی جا رہی ہے
میں تو آج بھی تنہا ہوں کل کی طرح محسن
ساری کائنات تو اس کے ساتھ ہوتی جا رہی ہے

رات سے اسے شدید فلو ہو رہا تھا، وہ بستر میں گھسی ہوئی تھی۔ دل کو عجیب ہی بے کلی تھی۔ کروٹیں بدل بدل کر اب جیسے ہڈیاں بھی دکھ رہی تھیں، مگر نیند تھی کہ ہنوز آنکھوں سے روٹھی ہوئی تھی۔

''بی بی جان! شاہ سائیں کب آئیں گے۔'' پتا نہیں کیوں آج وہ بی بی جان سے پوچھ بیٹھی۔ وہ ہنس پڑیں۔

''مردوں کو سو کام ہوتے ہیں بیٹی! آ جائے گا ایک دو دن میں۔'' انہوں نے ہلکا سا جتایا۔

وہ خفیف سی ہو کر اٹھ گئی۔

☆☆☆

کمرے میں گہری تاریکی تھی۔ بیڈ پر آڑھا ترچھا دراز وجود گہری نیند میں تھا، یوں کہ اس کی دائیں ٹانگ بیڈ سے نیچے لٹک رہی تھی اور بایاں بازو سینے کے نیچے دبا ہوا تھا۔ اس کی اس قدر گہری نیند نما بے ہوشی کا سبب غالباً نہیں یقیناً وہاں بکھری تین چار خالی بوتلیں تھیں جن میں

موجود مشروب لازماً پیٹ میں انڈیلا جا چکا تھا۔ بیٹ شیٹ پر جا بجا سلوٹیں تھیں۔ بے شمار سگریٹوں کے ٹوٹے بکھرے تھے اور کافی کا خالی مگ بھی لڑھکا ہوا تھا۔ قریب ہی سلور گرے، چمکتا ہوا سیل فون پڑا تھا جو کہ ہر دو منٹ کے وقفے کے بعد زور و شور سے بجنا شروع ہوتا مگر اس کی مدہوشی میں کوئی خلل نہیں پڑا، وہ اسی طرح پڑا رہا۔

فون ایک بار پھر بج رہا تھا اور اس کے ساتھ اس بار زور سے دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔ چند لمحے وہ مندی آنکھوں سے دیوار کو دیکھتا رہا۔ اگلے ہی لمحے وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کا دھیان دروازے کی طرف گیا مگر پاس ہی بجتے فون نے اس کی توجہ کا مرکز بدل دیا۔ اس نے فون اٹھایا۔ دستک کی آواز اب رک چکی تھی۔

''فضل! کیا بات ہے، کدھر ہو تم؟ کل سے تمہارا نمبر ملا رہا ہوں۔ نثار کو بھی پیغام دیا تھا کہ تم سے کہے مجھے فون کرو مگر تم..... آخر ہو کہاں؟ ایک فون بھی نہیں کر سکے تم کہاں ہو؟ میں اتنا پریشان ہوں۔''

شاہ محمود کے بغیر اسے لتاڑ رہے تھے۔

شاہ فضل کی آنکھیں پوری طرح کھل گئیں۔ ساتھ ہی ساری اذیت و درد، احساس جرم اور خوف نے یکلخت اس پر پھر پوری شدت سے حملہ کر دیا تھا۔ اس کا دل چاہا وہ سب چھوڑ چھاڑ کر کسی بل میں چھپ جائے۔

''خیریت بابا سائیں؟'' اس کا لہجہ دھیما تھا۔

شاہ محمود بری طرح چونکے تھے۔

''ہاں۔ خیریت ہی ہے، کل تک اپنے کام نمٹا کر آ جاؤ، کل بیٹھک ہے۔ کچھ اہم فیصلے لینے ہیں۔ اس میں تمہاری شرکت ضروری ہے'' انہوں نے بتایا۔

''اگر نہ آ سکوں تو؟ اس نے کہتے ہوئے لب بھینچے تھے۔ ایک انی سی سینے میں گڑی تھی۔

''نہیں۔ تمہیں آنا پڑے گا۔ میں نے کہا نا! تمہارا ہونا ناگزیر ہے۔'' ان کا لہجہ تحکمانہ تھا۔

شاہ فضل نے قدرے توقف کے بعد ہامی بھر لی۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد انہوں نے فون بند کر دیا۔ مگر ایک بار پھر اسے آنے کی تلقین کی، وہ فون ہاتھ میں لیے

ساکت بیٹھا تھا۔

''اربیجہ کا سامنا کیسے کرے گا؟''

درد کی ایک لہر اس کی بائیں کنپٹی سے چلتی ہوئی سارے سر میں پھیل گئی۔ اس کے غرور اور انا پر پڑنے والی یہ چوٹ بڑی کاری تھی اور چونکہ پہلی بھی تھی، اس لیے اذیت کی ہر حد پار کر رہی تھی۔

وہ اٹھا اور واش روم کی سمت بڑھ گیا۔ دیر تک نیم گرم پانی سے شاور لینے کے بعد اس کی طبیعت کچھ سنبھلی۔ اس نے باہر آ کر بال بنائے اور کمرے کی ابتر حالت کو نظر انداز کرتا باہر کی سمت بڑھ گیا۔ نثار اسے لاؤنج میں ہی پریشانی سے ادھر ادھر ٹہلتا ہوا مل گیا۔ وہ اسے دیکھتے ہی اس کی سمت لپکا۔

''شاہ سائیں! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا! کل سے یوں کمرہ بند کیوں ہیں؟ حویلی سے بڑے شاہ سائیں کے کتنے ہی فون آ چکے ہیں۔ میں بھی صبح سے دروازہ بجا رہا ہوں۔ آپ..... آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں'' وہ پریشانی سے بولتا گیا۔

شاہ فضل نے سرد نظروں سے اسے دیکھا، اگلے ہی لمحے نثار کا منہ بند ہو گیا۔

''گاڑی نکالو۔ ہم فیکٹری چل رہے ہیں''

''جو حکم سائیں'' وہ سر جھکا کر باہر نکل گیا۔

فیکٹری میں چند ضروری کام نمٹا کر وہ حویلی کے لیے روانہ ہو گیا۔ ذہن مختلف سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ جس وقت اس کی گاڑی حویلی میں داخل ہوئی، رات چاروں طرف اپنے پر پھیلا چکی تھی۔ تاریکی میں پام اور سفیدے کے درخت ساکت کھڑے تھے اور ان کی شاخیں دھند میں لپٹی ہوئی تھیں یہی دھند اس کے دل پر بھی چھا رہی تھی۔ وہ دل پر ڈھیروں بوجھ سنبھالے مردان خانے کی سمت بڑھ گیا۔

اس کی آمد کی خبر سب سے پہلے ندرت کو ہوئی جس نے سرونٹ کوارٹرز کی طرف جاتے ہوئے نثار کو دیکھا تھا۔ وہ الٹے قدموں پلٹی اور اس کے کمرے تک پہنچی آہستگی سے دروازہ بجایا۔

''آؤ، ندرت'' وہ دستک پہنچان چکا تھا۔

''سلام شاہ سائیں!'' اس نے ادب سے کہا۔

شاہ فضل نے چادر کندھوں سے اتار کر ایک طرف پھینکی اور اس کی طرف مڑا۔

''اربیحہ کہاں ہے؟'' ندرت کو اس کی آواز میں عجیب سی بات محسوس ہوئی مگر وہ اسے کوئی نام نہ دے سکی۔

''وہ بیگم سائیں کے کمرے میں ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے۔ تم جاؤ'' اس نے جانے کا اشارہ کیا۔

کچھ کھائیں گے آپ؟ چائے، کافی؟''

''نہیں''

وہ خاموشی سے باہر نکل گئی۔

وہ صوفہ پر بیٹھ گیا۔ سائیڈ ٹیبل سے گلاس اٹھایا اور آہستہ آہستہ مشروب اس کے اندر انڈیلا۔ اس کو آخری حد تک لبریز کر کے اس نے بوتل سائیڈ پر رکھی اور ایک لمبا سا گھونٹ لیا، پھر تیز تیز گھونٹ بھرنے لگا۔

اس وقت وہ دوسرا گلاس ختم کر رہا تھا۔ جب دروازہ کھلا اور اربیحہ اندر آئی۔

''سلام شاہ سائیں!''

شاہ فضل نے سرخ نظریں اٹھا کر اسے دیکھا اور تب اربیحہ کو ادراک ہوا کہ وہ کس شغل میں مصروف ہے۔ اسے جھٹکا لگا۔ وہ بے ساختہ اس کی طرف بڑھی۔

''آپ یہ..... یہ کب سے پینے لگے؟ میں نے آپ کو کبھی پہلے نہیں دیکھا'' اس نے بڑے سرد لہجے میں کہا۔

اس کا لہجہ، اس کی لرزتی آواز اور آنسوؤں سے لبریز آنکھیں جیسے سارے راز عیاں کرنے پہ تلی بیٹھی تھیں۔

''تو.....؟ ثابت ہو گیا کہ مجھ میں ہر برائی موجود ہے پھر؟'' اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

اربیحہ کے حلق میں آنسوؤں کا پھندا سا لگ گیا۔ وہ ایک بار پھر گلاس بھر رہا تھا۔

''اربیحہ! بیٹھ جاؤ'' اس کا لہجہ بڑا عجیب تھا۔ دھیما سلگتا ہوا۔

اربیحہ خاموشی سے اس کے پیروں کے نزدیک ٹک گئی۔ شاہ فضل کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں بھینچ لیا تھا۔

''اگر میں اس فیصلے کا اختیار تمہارے ہاتھ میں دوں کہ تم مجھے چھوڑ کر جانا چاہو تو جا سکتی ہو..... تو تمہارا فیصلہ کیا ہوگا؟'' اس کا لہجہ بڑا سپاٹ تھا۔

''یہ کیسا سوال ہے؟'' وہ تڑپ کر بولی۔

''میں تمہارے جواب کا انتظار کر رہا ہوں۔'' اس نے کہا۔

وہ پھٹ سی پڑی۔ ''آپ..... آپ ہمیشہ مجھ سے اتنے مشکل سوال کیوں کرتے ہیں؟ آپ کو مزا آتا ہے نا مجھے مشکل میں ڈال کر'' وہ سسک اٹھی۔

شاہ فضل نے خالی گلاس ٹیبل پر پٹخا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے برابر بٹھا لیا۔ دونوں ہاتھ سختی سے اس کے شانوں پہ جما دیئے۔

''میری بات کا جواب دو اربیحہ! میں پاگل ہو رہا ہوں'' اس نے وحشت سے اس کے شانے جھنجھوڑ ڈالے۔

وہ زور زور سے رونے لگی۔

''میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔'' وہ سسکیوں کے درمیان بولی۔

''کیوں نہیں ہے تمہارے پاس جواب۔ کیا تم آزادی نہیں چاہتیں؟''

''کیا یہ بھی آپ کے انتقام کا حصہ ہے۔'' آنسو پونچھ کر اس نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

''بے وقوف لڑکی! میں تو تمہیں رہائی دے رہا ہوں۔'' وہ تلخی سے ہنسا۔

''رہائی؟ آپ مجھے ہمیشہ کے لیے رہائی دے دیں مجھے جان سے مار ڈالیں''

''اربیحہ! تم سمجھتی کیوں نہیں ہو؟ تمہیں کیسے بتاؤں؟'' وہ زچ ہو گیا۔

''میں سب سمجھتی ہوں۔ آپ کو مجھے اذیت دے کر خوشی ملتی ہے۔ آپ کے انتقام کے جذبہ کی تسکین ہوتی ہے آپ میری مرضی کیوں پوچھ رہے ہیں؟ مجھے فیصلہ سنائیں۔ جو آپ چاہتے ہیں''

وہ زچ ہو گیا

اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ اسے سب کچھ سچ سچ بتا دے۔

اس نے دل کڑا کر کے اس کو سب بتانا شروع کر دیا شروع سے لے کر آخر تک بنا رکے بنا چھپائے اس نے اربیحہ کو حرف بہ حرف بتا دیا۔

وہ زرد چہرے کے ساتھ اسے دیکھتی گئی اسے یوں لگ رہا تھا جیسے دیواروں اور چھتوں کا سارا بوجھ اس پر گر رہا ہو۔ وہ بلند آواز میں رونا چاہتی تھی۔ وہ سانس لینا چاہتی تھی، مگر اس کا وجود ملبے تلے دبتا جا رہا تھا۔

اس نے زور سے سانس لینے کی کوشش کی، مگر ناکام رہی، اس کی آنکھوں کے گرد دھندلا غبار چھپانے لگا شاہ فضل کے ہلتے ہونٹ بس اسے دکھائی دے رہے تھے وہ یہ ادراک کرنے میں ناکام تھی کہ وہ اب کیا کہہ رہا تھا۔

اس کا سر زور سے چکرایا، اس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی، مگر بے سود۔ اگلے ہی لمحے وہ شاہ فضل کے بازوؤں میں آ رہی تھی۔ اس کا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا تھا۔

☆☆☆

اربیحہ اس وقت ''حمید لطیف ہسپتال لاہور'' کے گائنی وارڈ میں تھی، بی بی جان بینچ پر بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھیں ان کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔

وہی مخصوص ماحول، دوائیوں کی بو سے رچا بسا، پریشان چہرے لیے مریضوں کے لواحقین، تیز تیز چلتے ڈاکٹر اور آگے پیچھے بھاگتے وارڈ بوائز اور نرسز۔

شاہ فضل کے چہرے پر جیسے چٹانی سکوت چھایا ہوا تھا۔

ڈاکٹر فیاض باہر آئے تو شاہ فضل بے چینی سے ان کی سمت بڑھا۔

''آئی ایم سوری شاہ صاحب! ہم آپ کے بے بی کو نہ بچا سکے''

شاہ فضل کے سر پر جیسے آسمان ٹوٹ پڑا۔ وہ ساکت سا انہیں دیکھتا رہا۔

''آپ کی مسز کو اچانک کوئی گہرا صدمہ پہنچا ہے جس کی وجہ سے ان کی یہ کنڈیشن ہوئی، ہم نے پوری کوشش کی مگر جو خدا کی مرضی'' وہ اس کا شانہ تھپتھپا کر آگے بڑھ گئے۔

''آج ایک اور جرم تمہارے کھاتے میں درج ہو گیا شاہ فضل'' کوئی اس کے اندر چلایا تھا۔

وہ تھکے ہوئے انداز میں بینچ پر گر سا گیا۔ اس کی آنکھوں میں ریت سی چبھ رہی تھی۔

''کیا ہوتا اگر میں ابھی اسے نہ بتاتا مگر میں یہ برداشت نہیں کر سکا۔ یہ بوجھ نہیں، ڈھو سکا، سوچا اسے اتار کر پھینک دو، جتنی جلدی ہو سکے، یہ بھی نہیں سوچا کہ وہ اسے سہار پائے گی یا نہیں۔ کیا مجھ سے بڑھ کر کوئی خود غرض ہو سکتا ہے؟''

اسے اپنے آپ سے شرم آئی۔ بی بی جان اب نرس سے پوچھ رہی تھیں جوان کو ان کی زبان میں بتا کر آگے چل دی۔ اس نے بی بی جان کی سسکیاں سنیں اس کا دل چاہا خود کو شوٹ کر لے۔

وہ جھٹکے سے اٹھا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا۔ وہ کسی کا سامنا کرنے کی کنڈیشن میں نہیں تھا۔ اربیحہ کا تو بالکل بھی نہیں۔

وہ بیڈ پر سیدھی لیٹی تھی کمرے میں گہری تاریکی تھی، اتنی گہری کے اسے کسی قبر کا گمان ہو رہا تھا وہ اس کے نزدیک تھا، اپنی تمام تر درندگی اور سفاکی کے ساتھ ''میں بے قصور ہوں۔ شاہ سائیں!'' وہ بند آنکھوں سے سسکی تھی۔

یک لخت اس کی گردن ایک مضبوط ہاتھ کے شکنجے میں کسی گئی، وہ بے پناہ اذیت سے تڑپی تھی اپنے دونوں ہاتھوں کی پوری قوت سے اس کے دونوں ہاتھ ہٹانے کی کوشش کی تھی، مگر ناکام رہی تھی۔

وہ بلند آواز سے چیخنے لگی۔

''میں بے قصور ہوں شاہ سائیں! مجھے مت ماریں۔ مجھے چھوڑ دیں۔ مجھ پہ رحم کریں۔ آپ کو اللہ کا واسطہ۔''

اس کے اعضاء میں ایک تشنجی اکڑاؤ آنے لگا۔ اس کی سانس ٹوٹ رہی تھی، اس کے وجود کو جھٹکے سے لگنے لگے۔ یک بیک دوڑتے قدموں کی آوازیں آنے لگیں۔ دھاڑ کی آواز سے دروازہ کھولا گیا۔ اور اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔ ساکت اور احساس سے عاری نگاہ یک ٹک چھت کو گھور رہی تھی۔ پتا نہیں کون اس پہ جھکا تھا، اگلے ہی لمحے اس نے اپنے دائیں ہاتھ پہ سوئی کی چبھن محسوس کی اور اس کے کچھ دیر بعد وہ دوبارہ سے غنودگی میں جا چکی تھی۔

بی بی جان گم صم سی اس کی حالت دیکھ رہی تھیں پتا ہیں، اربیحہ نے کون سا ڈراؤنا خواب دیکھا تھا جو یوں مدہوشی کے عالم میں اس قدر تکلیف اور شدت سے چلا رہی تھی۔ مستزاد اس کے الفاظ وہ گنگ سی تھیں۔

''فضل! کیا کر بیٹھے ہو اس بچی کے ساتھ؟'' وہ ہولتے ہوئے سوچ رہی تھیں۔

عجیب بیزار کن دنوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ وہ حویلی واپس آ گئی تھی۔ مگر اب تک

اس کا شاہ فضل سے سامنا نہیں ہوا تھا۔ وہ سارا دن کمرے میں بند رہتی۔ دوسری طرف وہ جا کر لاہور بیٹھ گیا تھا۔ آنے کا نام ہی نہ لے رہا تھا۔ بی بی جان اس کے معمولات کا جائزہ لیتی رہی تھیں اور اندر ہی اندر پریشان ہوتی رہتیں۔ کتنی ہی بار وہ شاہ محمود سے بات کر چکی تھیں کہ وہ فضل سے بات تو کریں کہ آخر وہ کیا چاہتا ہے۔ یہ آنکھ مچولی کا کھیل کب تک چلتا رہے گا۔

جنوری کا وسط چل رہا تھا۔ موسم بے حد سرد تھا۔ سورج ایسا ضدی تو نہیں تھا کہ چہرہ دکھانے کا روادار ہی نہ تھا اور دھند تھی کہ ایک ماں کی طرح سارا سارا دن فضا کو آغوش میں لیے رکھتی۔

وہ تیرہ جنوری کا دن تھا، سردی تمام دنوں سے بڑھ کر تھی۔

بی ایم ڈبلیو تیزی سے کچے رستے پہ دوڑ رہی تھی کچھ دور جا کر وہ قبرستان کے گیٹ کے قریب رک گئی۔ دروازہ کھلا، باہر آنے والی ہستی شاہ فضل کی تھی وہ ناک کی سیدھ میں چلتا مختلف قبروں کے قریب سے گزرتا شاہ فیصل کی قبر کے قریب جا کر رک گیا۔ چند لمحے خالی خالی نظروں سے دیکھتا رہا، پھر تھکے ہوئے انداز میں نیچے بیٹھ گیا۔

''کیسے ہو فیصل؟'' اس نے ہاتھ قبر پر یوں رکھا گویا وہ فیصل کا شانہ ہو، آواز سرگوشی سے مشابہ تھی۔

''مجھے پتا ہے ٹھیک ہو گے۔ مجھے دیکھو! میرے ہاتھوں سے کچھ بھی ٹھیک نہیں ہوتا۔ دیکھو فیصل! تمہاری محبت میں' میں نے کتنے لوگ برباد کر ڈالے، کتنے دل اجاڑ ڈالے، وہ لڑکی..... وہ میرے دل کا ناسور بن گئی ہے۔ میں کیا کر چکا ہوں اس کے ساتھ۔ وہ مجھے کبھی معافی نہیں کرے گی، مگر میں اس سے معافی مانگوں گا بھی کیسے؟ مجھ میں تو اتنا حوصلہ ہی نہیں۔ تمہیں پتا ہے، نا میری ضدی اور انا پسند طبیعت کا۔ مجھے تو ابھی تک یقین نہیں ہوتا کہ میں..... میں فیصلے کی غلطی کر سکتا ہوں؟؟؟

مگر میں کر چکا ہوں مجھے تسلیم ہے

''مجھے اعتراف ہے کہ میں نے اس لڑکی کے ساتھ ہمیشہ زیادتی کی ہے آج بہت حوصلہ اور ہمت کے ساتھ جا رہا ہوں اس کا فیصلہ سننے۔ میری ہمت بندھاؤ یار!'' وہ کہتے ہوئے قبر سے لپٹ گیا۔

فضا میں ایک سرد سی خاموشی تھی یکلخت کوئی الو بہت کریہہ آواز میں چلایا تھا کچھ دور

موجود بیری کے درخت میں ہلچل سی مچل گئی ایک دم سے ایک مردہ چڑیا زمین پہ گری اور فضا چڑیوں کے شور سے بھر گئی۔ وہ ساکت سا یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا اور آنکھوں میں گہری دھند اترتی جا رہی تھی۔

''پتا ہے فیصل! بابا سائیں ''کار مختار'' کی پگ میرے سر پہ رکھنا چاہتے ہیں۔ ہونہہ۔ دیکھو نا کتنا بڑا مذاق ہے میرے ساتھ۔ میں تو رب کے اس فرمان کی پیروی نہیں کر سکا.....

''عورتوں کے معاملے میں خدا سے ڈرو''

تو لوگوں کو کیا دوں گا؟ میرے ہاتھ میں عدل نہیں ہے میں تو اپنے ساتھ انصاف نہیں کر سکا تو کسی دوسرے کے ساتھ؟'' اس نے لب دانتوں تک دبا کر جیسے اپنا دکھ بہنے سے روکا۔

''میں نے بابا سائیں سے کہہ دیا ہے کہ وہ اپنا فیصلہ واپس لیں گے تب ہی میں حویلی واپس آؤں گا۔ یہ ماں باپ کتنے مجبور ہوتے ہیں ناں! آج ہی ان کا فون آیا تھا۔ کہنے لگے۔ آجاؤ! مجھے مت ستاؤ۔ تمہاری ساری باتیں مان لوں گا'' وہ چند لمحے خاموشی سے بیٹھا رہا۔

''چلتا ہوں'' وہ اٹھ گیا۔

وہ شکستہ قدموں سے اپنی گاڑی کی سمت بڑھنے لگا بالکل کسی ایسے شخص کی مانند جو اپنا سب کچھ لٹا چکا ہو کچھ دیر بعد اس کی گاڑی حویلی کی طرف اڑی جا رہی تھی۔

جب وہ حویلی پہنچا تو بابا سائیں کسی کام سے نکلے ہوئے تھے۔ وہ بی بی جان کے کمرے کی سمت بڑھ گیا۔ وہ اسے دیکھ کر کھل اٹھی تھیں، کتنی ہی دیر اس کا سر منہ چومتی رہیں۔ وہ خود پر ضبط کرتا رہا، ورنہ دل چاہ رہا تھا کہ یہ فراخ آغوش میں جو سب خطائیں بھلا دیا کرتی ہے، اس میں چھپ کر سارے اعتراف کر لے۔

''بی بی جان! اربیہ کہاں ہے؟'' کچھ دیر بعد اس نے پوچھا۔

وہ تو جیسے بھری بیٹھی تھیں۔

''اپنے کمرے میں ہو گی اور کہاں۔ مجھے تو اس لڑکی کی سمجھ نہیں آتی فضل! مانتی ہوں کہ اس کے ساتھ غلط ہوا، مگر لوگوں کے ساتھ اس سے بھی بڑے حادثے ہو جاتے ہیں۔ یوں سب چھوڑ چھاڑ کر تو کوئی نہیں بیٹھتا۔ میں تو بار بیٹھی سمجھا سمجھا کر۔ دل چاہتا ہے تو کھانا کھا لیتی ہے، ورنہ سارا دن پڑی رہتی ہے۔ منہ سے کچھ نہ بولنے کی تو گویا قسم کھائے بیٹھی ہے''

وہ بولتی جا رہی تھیں۔ وہ ان سنی کر گیا۔

''میں بہت تھک گیا ہوں بی بی جان! اپنے کمرے میں جا رہا ہوں کھانا کھانے کا موڈ نہیں میرا۔ کسی کو مت بھیجے گا'' وہ چادر سنبھالتا اٹھ گیا۔ اس کے قدم تیزی سے مردان خانے کی سمت بڑھ رہے تھے۔ وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔

اربیحہ اس کو کھڑکی میں کھڑی نظر آئی۔ اس کی دروازے کی طرف پشت تھی۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر اس نے مڑ کر دیکھا اور وہیں جامد ہوگئی۔ وہ وہیں کھڑا اسے دیکھنے لگا، نظروں کا تصادم ہوا، اربیحہ نے پلکیں جھکا لیں۔

وہ آہستگی سے چلتا اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

''مجھے تمہارا فیصلہ چاہیے اربیحہ!'' اس کا لہجہ بڑا پرسکون اور ٹھنڈا تھا۔

''کیسا فیصلہ؟'' اس کی آواز میں تندی اور چہرے پر سرکشی تھی۔

شاہ فضل نے جیسے اس لمحے بے پناہ ضبط کیا تھا خود پر۔

''تم جانتی ہو۔''

''نہیں۔ میں نہیں جانتی۔ آپ بتائیں'' وہ چیلنج کرنے والے انداز میں بولی۔

''یہاں سے چلی جاؤ اربیحہ!'' اس کا لہجہ بڑا دھیما اور ایک التجا سمیٹے ہوئے تھا۔

اربیحہ نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

''آپ شاید بھول رہے ہیں شاہ فضل! خون بہا میں آنے والی عورتوں کو طلاق نہیں دی جاتی'' وہ طنزیہ انداز میں یاددہانی کروا رہی تھی۔

''میں اس روایت کو بدل دوں گا'' اس نے یقین دلایا۔

وہ بے ساختہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔ شاہ فضل نے اسے پہلی بار ہنستے ہوئے دیکھا تھا۔ اس کے ہموار چمکدار دانت بڑے خوبصورت تھے مگر ہنستے ہوئے اس کی آنکھوں میں پانی بھر آیا تھا۔

وہ خاموشی سے اس پر نظریں جمائے اسے دیکھتا رہا۔

''میں نے آپ سے زیادہ خودغرض انسان اپنی زندگی میں نہیں دیکھا۔ آپ کو اب لگنے لگا ہے کہ میں بے قصور ہوں؟ اوں ہوں۔ بے قصور تو میں دونوں صورتوں میں ہوں۔ جرم منصور لالہ کا تھا یا نہیں، اس بحث سے بالاتر۔ چلیں مان لیتی ہوں کہ آپ کو غصہ تھا، شدید دکھ تھا اپنے بھائی کا اور اسی غم و غصے کو غلط کرنے کے لیے آپ نے ہمیشہ مجھے نشانہ بنایا۔ نہ صرف نفسیاتی

تسکین بلکہ جنسی اور جسمانی تسکین کا بھی، آپ کی خودغرضی کا پہلا ثبوت۔ دوسرا تب جب آپ نے اپنی اولاد کے لیے اپنے وارث کے لیے مجھے اپنے برابر جگہ دی۔ اور اب جب وہ نہیں رہا تو یہ سزا ہے میرے لیے؟ یہ..... یہ کہ میں یہاں سے چلی جاؤں؟''

وہ بالکل بدلے ہوئے لہجے میں بول رہی تھی۔

''بس کرو اربیحہ'' اس کی برداشت جیسے ختم ہونے کو تھی۔

''آپ کیوں نہیں بس کر دیتے؟ ترس نہیں آتا آپ کو مجھ پر؟'' وہ پھٹ پڑی۔ زور زور سے روتے ہوئے اس نے شاہ فضل کا گریبان تھام لیا۔

''ایک گولی اتار دیں میرے سینے میں تاکہ آپ کو سکون مل جائے۔ مار ڈالیں مجھے'' وہ بلک رہی تھی۔

وہ سناٹے میں رہ گیا تھا اس نے دونوں ہاتھ اربیحہ کے شانوں پہ جما دیے۔

''سزا تو تم مجھے سناؤ۔ جانتی ہو کیا کہا ہے ڈاکٹرز نے؟ یہ کہ تمہاری یہ کنڈیشن یہ ابارشن کسی شدید ذہنی جھٹکے اور ٹینشن کا نتیجہ ہے تو قصوروار میں ہوا نا! اگر میں خود پر ضبط کر لیتا تو شاید ایسا نہ ہوتا مگر میں نے ایسا نہیں کیا۔ اسی لیے تم سے کہہ رہا ہوں اربیحہ! چلی جاؤ مجھے چھوڑ کر، چلی جاؤ یہاں سے'' اس نے ہاتھ ہٹا لیے اور دم سادھ لیا۔

فیصلے کی گھڑی آن پہنچی تھی۔

اربیحہ زرد رنگت اور پھیلی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''مجھے تم سے صرف یہ کہنا ہے کہ۔ میں تمہیں کچھ نہیں دے سکتا۔ تمہاری عمر ہی ابھی کیا ہے؟ زندگی میں تمہیں سب مل جائے گا، خوشیاں، سکون اور کوئی بہت اچھا شخص۔ مجھ سے تمہیں کیا ملا؟ کچھ نہیں کچھ بھی تو نہیں جاؤ اربیحہ۔ جاؤ'' وہ تھکے ہوئے انداز میں کہہ رہا تھا۔

اربیحہ کے ہاتھ جو ابھی تک اس کے گریبان پر تھے، بہت آہستگی سے پہلوؤں میں گر گئے۔

''چلی جاؤں یہاں سے؟'' وہ کھوئے کھوئے انداز میں بولی تھی۔

''کہاں چلی جاؤں؟ یہ تو میں بھی جانتی ہوں آپ بھی جانتے ہیں کہ حویلی کی بیٹیوں کی قسمتیں کبھی نہیں بدلتیں۔

''لیکن اربیحہ! میں یہ؟'' اس نے کچھ کہنا چاہا تھا۔

''نہیں شاہ سائیں! اب اور کچھ نہیں آپ اپنا ریکارڈ صاف رکھنے کے لیے اپنے آپ کو اس احساس جرم سے چھٹکارا دلانے کے لیے چاہتے ہیں کہ میں یہاں سے چلی جاؤ مگر ایک بار پھر آپ خود غرضی دکھا رہے ہیں۔ کیا ضمانت ہے آپ کے پاس میری خوشیوں کی؟ میرے سکون کی؟ جو چیز آپ مجھے نہیں دے سکے، آپ کیسے توقع کر سکتے ہیں کہ وہ کوئی اور شخص مجھے دے پائے گا؟

کیسے؟ کیا آپ نہیں جانتے کہ اس معاشرے میں طلاق یافتہ عورت کی حیثیت کیا ہے؟ اور آپ یہ سوچے بیٹھے ہیں کہ کوئی اور ''اچھا سا شخص'' میری زندگی کی ساری کمیوں کو پورا کر دے گا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا، میں آپ کی بے وقوفی پر ہنسوں یا روؤں؟

میں آپ کو بتاتی ہوں شاہ سائیں کہ کیا ہوگا؟

جب اربیجہ یہاں سے ماتھے پہ ٹھکرائی ہوئی عورت کا داغ لے کر جائے گی تو اس کے اپنے ماں باپ اسے بوجھ تصور کریں گے۔ وہ مجبوراً چند ماہ برداشت کریں گے پھر اسے کسی اور کے سر لادنے کی سوچیں گے اور وہ ''کوئی اور'' جو کوئی بھی ہوگا، دو تین بچوں کا باپ، دوسری شادی کا شوقین کوئی بوڑھا، دوسری تیسری بیوی کا امیدوار، کوئی اولاد کا خواہش مند، وہ ان میں سے کوئی بھی ہو سکتا ہے، مگر وہ ہرگز نہیں ہوگا جو آپ سوچ رہے ہیں۔ اور تب کیا حیثیت ہوگی اربیجہ کی؟ وہی جو یہاں ہے''

شاہ فضل کو لگ رہا تھا کہ اس کے وجود کے سینکڑوں ٹکڑے کر دیے گئے ہوں، ہر ٹکڑا ناقابل برداشت اذیت میں مبتلا تھا۔ وہ خود کو اس اذیت سے نجات دلانا چاہتا تھا، وہ چیخنا چاہتا تھا، وہ رونا چاہتا تھا بلند آواز میں، مگر وہ کچھ نہ کر سکا، وہ بے بسی کے احساس سے چور اس کے سامنے گر پڑا۔

''دیکھو اربیجہ! میں کتنا کنگال ہوں۔ میرے پاس کوئی اچھا عمل، کوئی نرم بات اور کوئی خوبصورت رات نہیں ہے جس کی بنیاد بنا کر میں تمہیں کہہ سکوں کہ تم یہ لے لو اور اس کے بدلے مجھے معاف کر دو۔ میں تو اس قابل بھی نہیں کہ تم سے معافی مانگ سکوں۔'' وہ لمبا چوڑا مرد، وہ حاکم پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ وقت کا کیسا الٹ پھیر تھا۔

وہ خاموشی سے روتی رہی، جیسے کچھ نہ کہنا چاہتی ہو۔

ایک بار پھر ایک تاریک اور سیاہ رات ان کے درمیان آ رہی تھی، لرزی راتوں کی

مانند اس میں سختی نہیں تھی، جبر نہیں تھا، اذیت نہیں تھی۔

وہ بیڈ پر ندی کے دو کناروں کی مانند دراز تھے اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کب ملنے والے تھے؟ ملنے والے تھے بھی یا نہیں؟

☆☆☆

غموں کی جو فصیل ہے
وہ اس قدر طویل ہے
غضب تو ہے کہ اک نہیں
فصیل در فصیل ہے
تم اس کی ہر منڈیر پر
آرزوؤں کے تیل سے
چراغ دل جلاؤ ناں
ذرا سا مسکراؤ ناں
ذرا سا مسکراؤ ناں!

زندگی ایک بار پھر اپنی ڈگر پر رواں دواں ہو گئی تھی، وہی پرانی ڈگر! وہ اسی طرح اس کے آگے پیچھے پھرتی۔ اس کے کام کرتی، اس کے پیر دباتی مگر رات ہوتے ہی وہ کسی سنڈریلا کی مانند بدل جاتی۔ خاموشی سے تکیہ اٹھاتی اور بیڈ کے دوسرے کنارے پر دراز ہو جاتی اور وہ صرف لب چبا کر رہ جاتا، وہ اس فاصلے کو پاٹنا چاہتا تھا مگر ایک چیز مانع تھی اور وہ تھا اربیجہ کا گریز۔

وہ جانتا تھا وہ اس سے بچ رہی تھی، وہ اب تک بڑے ضبط اور حوصلے سے خود پہ قابو پا رہا تھا، مگر کب یہ پیمانہ لبریز ہو جائے، کوئی نہیں جانتا تھا۔

ان بیزار کن اور سرد مزاج دنوں میں ایک حیرت انگیز بات ندرت کے لیے نثار کا پرپوزل تھا۔ بی بی جان نے ندرت کے سرپرست کی حیثیت سے ہاں کر دی تھی۔ دونوں ہی شاہ فضل کے ملازم خاص کی حیثیت رکھتے تھے اس لیے اسے بھی کوئی اعتراض نہ تھا۔

وہ پہر دوپہر کا دن تھا۔ صبح سے ہی فضا دھند آلود تھی۔ سرد ہوا گویا ہڈیوں میں گھس رہی تھی؟ شاہ فضل معمول کے کام نمٹا کے لوٹا تو اربیجہ اس کے لیے چائے لے آئی۔ اس نے

تشکرانہ نظروں سے اسے دیکھا، اسے اس وقت چائے کی شدید طلب ہو رہی تھی۔ رات جب وہ اپنے اردگرد ڈھیروں کاغذات پھیلائے بے حد مصروف تھا اور اربیجہ نائٹ سوٹ بدلنے کے بعد ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی بال بنا رہی تھی۔ دروازہ بجا کر ندرت اندر آئی، وہ دونوں کے لیے گرم دودھ لائی تھی۔

''سلام شاہ سائیں!'' اس نے دودھ سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔

جواباً اس نے صرف سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ وہ واپس جانے کے لیے مڑی ہی تھی کہ شاہ فضل نے آواز دی۔

''جی سائیں!'' وہ بولی۔

''مجھے تم سے نثار کے بارے میں بات کرنی ہے'' اس نے کہا۔

ندرت کا رنگ فق ہو گیا۔

''کک۔ کیا بات ہے سائیں!'' وہ ہکلا گئی۔

ایک جھماکے سے اس کے دماغ میں اربیجہ کی شبیہہ لہرا گئی، وہ بھی تو اس سے ایسے ہی ڈرتی تھی، لیکن حیرانی کی بات تو یہ تھی آخر ندرت کیوں ڈر رہی تھی؟

''تم خوش ہو اس شادی سے؟'' سنجیدگی سے پوچھا۔

''بیگم سائیں خوش ہیں، آپ خوش ہیں، میرے لیے اس سے بڑی خوشی کیا ہوگی؟'' وہ آنسو چھپانے کے لیے تیز تیز پلکیں جھپکانے لگی۔

''بات ہماری خوشی کی نہیں۔ زندگی تمہیں گزارنی ہے'' وہ سمجھانے والے انداز میں بولا۔

اربیجہ نے برش کرتے ہوئے استہزائیہ انداز میں اس ''براڈ مائینڈڈ'' انسان کو دیکھا۔

ندرت خاموشی سے کھڑی رہی۔ شاہ فضل کھوجنے والے انداز میں اس کا جائزہ لیتا رہا۔

''ٹھیک ہے جاؤ'' اس نے جانے کی اجازت دی۔

وہ پلٹی اور سر جھکا کر باہر چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد وہ اٹھا، دروازہ لاک کیا اور آتش دان کے پاس دھری ایزی چیئر پہ آ کر براجمان ہو گیا۔ جلتی لکڑیوں اور بھڑکتے شعلوں کا جائزہ لیتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ اس کا دل بھی تو ایسے ہی جل رہا تھا۔

اربیجہ اٹھی اور دودھ کا گلاس اٹھا کر اس کے پاس چلی آئی۔

''دودھ لے لیں'' اس نے گلاس اس کی طرف بڑھایا۔

''اربیجہ!'' اس نے بے تابی سے اس کو دیکھا۔

''جی۔'' اس نے نظر جھکا لی۔

شاہ فضل نے کچھ کہنا چاہا مگر کہہ نہیں پایا۔

''رکھ دو۔ لے لوں گا'' اس نے نظریں پھر سے آتش دان پہ جما دیں۔

اربیجہ نے بنا کچھ کہے گلاس رکھا اور بڑی سی سلائیڈنگ ونڈو کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔

لان تاریک اور دھندلا تھا، بالکل اس کی قسمت کی طرح وہ خاموش اندھیرے میں کچھ کھوجتی رہی۔

''مطلع صاف نہیں ہے، لگتا ہے بارش ہو گی۔''

شاہ فضل کی آواز پر وہ چونکی، پتا نہیں وہ کب اس کے پاس آ کھڑا ہوا تھا۔

''پتا نہیں۔'' وہ مدھم آواز میں بولی۔

''میں سوچ رہا ہوں کہ کل ''ملک ہاؤس'' چلیں''

اربیجہ نے حیرانی سے اسے دیکھا مگر کچھ نہیں کہا۔

''تمہارا کیا خیال ہے؟'' اس نے اربیجہ کو بولنے پہ اکسایا، وہ اتنا خاموش رہتی تھی کہ اسے بات کرنے پر مجبور کرنے کے لیے وہ کتنی ہی دیر لایعنی باتیں کرتا رہتا تھا۔

''جیسے آپ کی مرضی'' وہ آہستگی سے بولی۔

شاہ فضل کو اس کی فرماں برداری سے عجیب سی وحشت ہوئی۔

''آؤ! سو جاؤ'' رات بہت ہو گئی ہے'' وہ بیڈ کی سمت بڑھ گیا۔

وہ اس کی تقلید کرتی ہوئی بیڈ کے نزدیک آ گئی۔ وہ نیم دراز ہوا تو اس کے پیر دبانے کے لیے اس کے پائنتی بیٹھ گئی۔ اس کے ہاتھوں نے نرمی سے شاہ فضل کے پیروں کو چھوا تو ایک سکون اس کے اندر تک اترتا چلا گیا۔

اس نے بغور اربیجہ کو دیکھا۔ وہ گلابی نائٹ سوٹ میں تھی۔ بالوں کو چھوٹے سے ہیئر بینڈ میں سمیٹے، رنگت میں زردیاں لیے ہوئے، آنکھوں کے گرد گہرے حلقے اور پپڑی زرد

ہونٹ، درد کی ایک لہر اس کے دل میں اٹھی اور سارے وجود میں پھیل گئی اس نے اپنے پیر کھینچ لیے۔

اس نے دایاں بازو موڑ کر آنکھوں پہ رکھ لیا، جیسے اپنے تاثرات چھپانا چاہتا ہو۔

وہ اٹھی اور اپنی مخصوص جگہ پہ جا کے دراز ہو گئی کمرے میں زہرناک خاموشی تھی صرف دو نفوس کے تنفس کی آواز کے سوا کوئی آواز نہ تھی۔ کچھ دیر بعد شاہ فضل نے بازو ہٹا کے اسے دیکھا وہ اس کی طرف رخ کیے سو رہی تھی ایک بازو سینے کے ساتھ لگائے اور دوسرا ہاتھ گال کے نیچے دھرے، بنا لحافظ اوڑھے وہ بے خبر سو رہی تھی، اس نے لحافظ اس پہ ڈالا اور روشنیاں بجھا دیں۔

''شاید جن کے ضمیر پر کوئی بوجھ نہیں ہوتا وہ اسی طرح سو جاتے ہیں، بے خبر اور مطمئن نیند اور میں؟ مجھے نیند ہی نہیں آتی، یوں لگتا ہے اب قسمت میں جاگنا ہی رہ گیا ہے۔''

وہ دل پہ ڈھیروں بوجھ سنبھالے اٹھا اور ٹیرس کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ ٹیرس تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا، سرد ہوا جسم کے آر پار ہو رہی تھی۔ وہ خاموشی سے ٹیرس پر رہا، رات قطرہ قطرہ بھیگ رہی تھی، وہ ہر احساس سے بے نیاز دور تاریکی میں جانے کیا کھوج رہا تھا۔

جانے کتنا وقت بیتا، وہ تھک کر اٹھا اور اندر واپس جانے کے لیے قدم بڑھائے ہی تھے کہ لمحہ بھر ٹھٹھک سا گیا۔ اسے یوں لگا جیسے کوئی سرونٹ کوارٹر سے نکل کر لان کے خارجی حصے کی طرف جا رہا ہو، اس نے تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ بہت دور سے خشک پتوں پہ چلنے کی مدھم سی آواز آ رہی تھی اسے ایس پی عباس کی بات یاد آئی۔

''پیٹھ میں چھرا گھونپنے والے اپنے ہی ہوتے ہیں، اپنے اردگرد خصوصی نظر رکھیے''

وہ تیزی سے واپس پلٹا اور کمرے سے اپنا ریوالور نکال لایا۔ سیاہ چادر مضبوطی سے اپنے گرد لپیٹتے ہوئے اس نے سلیپر وہیں اتار دیے اور تیزی سے اس سمت بڑھنے لگا۔ اچانک بادل گرج اٹھے۔ بجلی کڑکی اور تاریکی میں ایک پل کو روشنی سی پھیل گئی اور اس روشنی میں ایک درخت کے نیچے کھڑے دو سائے فوراً اس کی نگاہ میں آ گئے۔

وہ احتیاط سے ان کی سمت بڑھنے لگا۔ کچھ نزدیک پہنچ کر اس نے خود کو ایک درخت کے تنے کی آڑ میں چھپایا اور سر نکال کر ماحول کا جائزہ لینا چاہا، اسی وقت ایک گھٹی گھٹی نسوانی چیخ نے اسے منجمد سا کر دیا۔ یہ آواز اس کے لیے بڑی جانی پہچانی تھی، دھوکہ کھانے کا سوال ہی نہ تھا۔

وہ ندرت کی آواز تھی۔

پھر یک لخت اونچا اونچا بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ الفاظ صاف نہیں تھے۔ اسے سمجھنے میں دشواری ہو رہی تھی۔ وہ کچھ مزید آگے سرکا۔

''اگر تو نے منہ کھولنے کی کوشش کی تو تیرا انجام بھی اس شاہ فیصل کی طرح ہو گا۔ سمجھی تو؟'' کوئی غرایا تھا۔

بجلی کڑکی اور جیسے شاہ فضل پہ ہی آ گری۔

یہ نثار کی آواز تھی وہ حیرت کی زیادتی سے ساکت سا کھڑا تھا۔

''تو چھپا نہیں سکے گا یاد رکھنا شاہ سائیں پولیس سے تحقیقات کرا رہے ہیں اور ایک نہ ایک دن وہ جان لیں گے کہ قاتل تو ہے۔ تو نے مارا ہے شاہ فیصل کو۔ یہ سچ سامنے آ کے رہے گا اور پھر تو دیکھنا نثار! تیرا کیا حشر ہو گا؟ شاہ سائیں تجھے کتوں کے آگے ڈال دیں گے''

غصہ میں اس کی آواز اونچی ہو گئی تھی۔

''کیسے پتا چلے گا؟ کون بتائے گا انہیں؟ تو..... تو بتائے گی؟ بول؟'' اس نے شاید ندرت کے بال مٹھی میں جکڑ لیے تھے۔

وہ گھٹی گھٹی آواز میں چیخنے لگی۔

''میرے بال چھوڑ ذلیل آدمی! کس بات کا بدلہ لیا تو نے چھوٹے سائیں سے؟ کیا بگاڑا تھا انہوں نے تیرا؟'' تکلیف اور غصہ میں اس کی آواز تیز ہو گئی۔

''جاننا چاہتی ہے نا! تو سن! شاہ فضل نے گلزار کو راکھے (کھیتوں کی رکھوالی کرنے والے) کے ساتھ رات کو پانی لگانے بھیج دیا تھا اسے ٹھنڈ لگ گئی، نمونیہ ہو گیا تھا اسے اور تین دن صرف تین دن بعد وہ مر گیا، اس شاہ فضل کی وجہ سے میرا بھائی مر گیا۔ یہ وڈیرے..... یہ شاہ زادے خود کو فرعون سمجھتے ہیں۔ لوگوں کو یوں سزائیں سناتے ہیں جیسے وہ ان کے زرخرید ہوں۔ یہ..... یہ ہی ذمہ دار ہیں میرے بھائی کے مرنے کے۔ تب میں نے عہد کیا تھا کہ میں ان سے بدلا لوں گا۔ اس شاہ فیصل کو مار ڈالوں گا تا کہ شاہ فضل کو پتا چلے کہ جب..... جب خود پہ پڑتی ہے تو کیا گزرتی ہے..... اور میں نے ایسا ہی کیا..... کوئی نہیں جانتا کہ گولی میں نے چلائی تھی اور کوئی جان بھی نہیں سکے گا مگر تو..... غلطی ہوئی مجھ سے کہ تجھ کو بتا دیا۔ یہ بھول گیا کہ عورت ایسی چیز ہے جو کبھی راز نہیں رکھ سکتی مگر اب نہیں..... اس سے پہلے کہ تو انہیں بتائے؟ میں تیرا قصہ ہی پاک کر دوں گا'' وہ سفاکی سے بولا اور ریوالور نکال لیا۔

ندرت پھٹی پھٹی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی اور شاہ فضل ساکت کھڑا سب سن رہا تھا۔اس وقت وہ خون جما دینے والی سردی سے بھی بے نیاز ہو چکا تھا۔

''تو مجھے مار ڈالے گا؟'' وہ دہشت زدہ تھی۔

''ہاں، تیری صورت میں ایک مستقل خطرہ میرے ساتھ رہے گا، تو مجھے پیاری ضرور ہے مگر اپنی زندگی سے زیادہ نہیں'' اس کا لہجہ کمینگی سے بھرا ہوا تھا۔

بادل زور سے گرجے اور بارش شروع ہو گئی۔فضا میں فائر کی آواز گونج اٹھی۔ندرت کے حلق سے نکلنے والی چیخ بڑی خوفناک اور دل دہلا دینے والی تھی۔

☆☆☆

کمرے کی فضا میں تین نفوس کی موجودگی کے باوجود پراسرار خاموشی تھی۔وہ زمین پہ گری ہوئی تھی اس کے کپڑوں پہ مٹی کے داغ تھے۔دونوں ہاتھ سر پہ رکھے وہ مسلسل رو رہی تھی۔

''یہ رونا دھونا بند کر لڑکی! اور مجھے سچ سچ بتا یہ کھیل کب سے کھیل رہی تھی اس کے ساتھ مل کر؟''

شاہ محمود کی آواز میں گرد اور آنکھوں سے جیسے شعلے نکل رہے تھے۔

لڑکی کا رونا مزید تیز ہو گیا۔

''کیا پوچھ رہا ہوں میں تجھ سے؟'' وہ دھاڑے۔وہ ہنوز روئے جا رہی تھی۔

''فضل! اس کو یہاں سے لے جاؤ ورنہ میں.....؟ میں اس کو کتوں کے آگے ڈال دوں گا'' ان کے منہ سے تیزاب کی مانند ابلتے ہوئے لفظ نکلے تھے لڑکی کا رنگ فق ہو گیا۔

شاہ فضل نے لب بھینچتے ہوئے آگے بڑھ کر لڑکی کا بازو پکڑا اور اسے گھسیٹتے ہوئے باہر نکل گیا۔

''شاہ محمود فون لے کر ایک طرف بیٹھ گئے۔انہیں چند ضروری فون کرنے تھے، چند ضروری فیصلے کرنے تھے۔

''شاہ فضل کے سر پہ ''کار مختار'' کی پگ رکھنا تھی''

''نثار کی لاش کو ٹھکانے لگوانا تھا۔''

☆☆☆

وہ ہی لوگ میرے قدموں سے زمین کھینچ رہے ہیں جو لوگ میرے قد کے برابر

نہیں آتے۔

وہ کسی بپھرے ہوئے شیر کی مانند ادھر سے ادھر چکر کاٹ رہا تھا، آنکھوں کی سرخی گہری ہوتی جا رہی تھی۔

وہ رک گیا۔چند لمحے دہکتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا رہا، پھر ایک دم اس پہ جھپٹ پڑا۔

تھپڑ اس کے چہرے پر مارتے ہوئے اس نے دائیں ہاتھ سے اس کی گردن دبوچ لی۔

''اگر میں فائر نہ کرتا تو وہ تمہیں ختم کر دیتا، جانتی ہو؟ بتاؤ مجھے۔بولو کب سے جانتی تھیں تم؟ وہ غرایا تھا۔

''جب آپ لاہور گئے تھے اربیجہ بی بی کو لے کر'' وہ گھٹی گھٹی آواز میں بولی۔

''تب کیوں نہیں بتایا؟''

''تب..... بتانا چاہتی تھی سائیں! پر ہمت نہیں پڑتی تھی..... وہ..... وہ مجھے دھمکاتا تھا کہ اگر کسی کو بتایا تو بدنام کر دوں گا۔سائیں..... سائیں! میں نہیں کرنا چاہتی تھی۔وہ تو بیگم صاحبہ نے سائیں کے حکم پر..... نثار نے بیگم سائیں سے بات کی تھی شادی کے لی..... مجھ سے تو پوچھا ہی نہیں تھا، حکم دیا گیا تھا مجھے'' فضل نے اس کا بازو جھٹکے سے چھوڑا۔

''شاہ سائیں! اگر آپ وہاں نہ آتے تو میں مر چکی ہوتی۔اس وقت میں نے بڑی شدت سے اپنے رب سے دعا مانگی تھی کہ کاش! آپ کہیں سے آ جائیں یا مجھے چند پل مل جائیں تاکہ میں آپ کو سب بتا سکوں اور دیکھیں سائیں! اللہ تعالیٰ! کتنا مہربان ہے آپ خود بخود وہاں آ گئے'' وہ تشکر سے کہہ رہی تھی۔

کتنے بہت سے پردے ہٹ گئے آنکھوں سے۔

کتنے بہت سے راز فاش ہو گئے تھے

کتنی تلخ حقیقتیں سامنے آ گئی تھیں۔

اگر وہ فائر نہ کرتا تو نثار ندرت کو بھی موت کے منہ میں بھیج چکا ہوتا۔

اور شاہ فیصل کے اصل قاتل کا معما کبھی حل نہ ہوتا۔منصور ہنوز مجرم رہتا اور اربیجہ.....

''کل پنچائیت بیٹھ رہی ہے۔کیا بیان دو گی؟'' شاہ فضل نے ٹھوس لہجے میں کہا اور ندرت نے سر جھکا لیا۔تب ہی اربیجہ وہاں آ گئی۔

''نثار کی موت کے بارے میں؟'' اس نے سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا۔

ندرت خاموشی سے اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی، کمرے میں موجود خاموشی مزید پر اسرار لگنے لگی۔

''اس نے میری عزت پہ ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تھی اور اگر آپ وہاں نہ آتے تو وہ اپنے گندے ارادوں میں کامیاب ہو جاتا۔ آپ کو دیکھ کر اس نے پستول نکالیا۔ وہ پاگل ہو رہا تھا اگر آپ اسے نہ مارتے تو وہ سب ختم کر دیتا'' ندرت کا لہجہ بڑا مستحکم تھا۔

شاہ فضل حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''اتنی کمینگی کہاں سے لے لی تو نے؟'' اس کے لبوں پہ محظوظ مسکراہٹ آ گئی تھی۔

''آپ سے'' یہ آواز ندرت کی نہیں تھی۔ وہ بے ساختہ پیچھے مڑا۔

اسے کرنٹ سا لگا۔ اسٹڈی کے درمیانی دروازے پر اربیجہ بڑی دیر سے ٹیک لگائے کھڑی تھی اس کی پوری طرح روشن آنکھیں ثبوت تھیں۔ کہ وہ بڑی دیر سے جاگ رہی تھی اور کھڑی تھی۔

وہ آہستگی سے آگے بڑھ آئی۔

''تم جاؤ یہاں سے'' اس نے تحکمانہ انداز میں ندرت سے کہا۔

ندرت نے شاہ فضل کی طرف دیکھا جس نے اسے آنکھ سے باہر جانے کا اشارہ کیا، وہ باہر نکل گئی۔

''واہ شاہ سائیں واہ'' اس نے تالی بجائی۔

''سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ یہاں بند کمرے میں یہ منصوبہ بندی ہو رہی ہے کہ نثار کی موت کو فطری رنگ کیسے دیا جائے اور میرے سامنے مظلوم کا ناٹک کرتے ہیں آپ؟'' وہ چبا چبا کر بولی تھی۔

وہ خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

''آپ چاہتے ہیں نا! کہ میں آپ کو معاف کر دوں؟ آپ کی طرف پلٹ آؤں تو پھر آپ کل یہ اعلان کر دیں کہ میرا بھائی بے گناہ ہے۔ میرے بابا سے معافی مانگیں، آپ چاہتے تھے نا! کہ آپ کے پاس کوئی ایسا عمل ہو جو آپ مجھے دے کر مجھ سے معافی مانگ سکیں۔ چاہتے تھے نا؟ تو جان لیجیے! آپ کا یہ عمل مجھے ہمیشہ کے لیے آپ کا کر دے گا'' اربیجہ نے پرسکون لہجے

میں کہتے ہوئے داؤ کھیلا تھا۔

شاہ فضل جیسے زلزلے کی زد میں تھا۔ توڑ پھوڑ کے آثار اس کے چہرے سے عیاں تھے۔

''اور یاد رکھیے گا شاہ سائیں جو شخص غلطی تسلیم نہیں کرتا وہ اصلاح نہیں چاہتا۔ جب میں بے قصور ہوتے ہوئے سزا سہہ سکتی ہوں تو آپ غلط ہوتے ہوئے غلطی تسلیم کیوں نہیں کر سکتے؟''

وہ اپنی بات مکمل کر کے کسی جھونکے کی مانند باہر نکل گئی۔

☆☆☆

اگلے دن پنچائیت کے تمام سرکردہ افراد موجود تھے۔ فیروز ملک کو بطور خاص مدعو کیا گیا تھا۔ ایس پی عباس بھی موجود تھا۔

کارروائی شروع ہوئی۔ شاہ محمود کے مصاحب خاص نے تفصیل سے ساری حقیقت حاضرین کے گوش گزار کی۔ گلزار کی موت سراسر طبعی تھی، اس میں کسی قسم کا تشدد یا بدلہ کی جھلک دکھائی نہ دیتی تھی، اس لیے نثار کے ہاتھوں شاہ فیصل کا قتل سراسر زیادتی اور ظلم قرار دیا گیا۔

ایس پی عباس نے حقائق پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ نثار نے کس طرح موقع کا فائدہ اٹھایا اور سارا الزام منصور ملک کے سر دھر دیا گیا مگر سچ ہے کہ مجرم بے پناہ ہوشیاری کے باوجود اپنا کوئی نہ کوئی سراغ چھوڑ جاتا ہے، اسی طرح اس سے یہ غلطی ہوئی کہ وہ منصور ملک کے اور اپنے ریوالور میں فرق کو نظر انداز کر گیا۔

پھر ندرت کا بیان لیا گیا جو کہ حقیقت پر مبنی تھا اور اس نے بتایا کہ نثار نے اسے خود بتایا تھا کہ شاہ فیصل کو اس نے قتل کیا تھا جب اس نے نثار کو دھمکایا کہ وہ سب کچھ شاہ فضل کو بتا دے گی تو وہ اسے بھی مارنے پہ تل گیا، حادثاتی طور پر شاہ فضل آ گیا جس نے نثار کا اعتراف اپنے کانوں سے سن لیا۔ اور اگر اس وقت وہ نثار پر گولی نہ چلاتا تو اپنا جرم چھپانے کی خاطر نثار، ندرت کو بھی موت کے گھاٹ اتار چکا ہوتا۔

آخر میں منصور ملک کو بے گناہ قرار دیا گیا اور کہا گیا کہ وہ جہاں کہیں بھی روپوش ہے، باعزت واپس آ جائے، اسے کچھ نہیں کہا جائے گا۔

دوسرا اہم فیصلہ ''کار مختار'' کا تھا سینکڑوں لوگوں کی موجودگی میں شاہ فضل کے سر پر

دستار رکھی گئی۔ خصوصی دعائیں مانگی گئیں۔ مبارک سلامت کا شور اٹھا تھا جب فیروز ملک نم آنکھیں لیے اس کے قریب آئے وہ بے ساختہ ان سے لپٹ گیا۔

''میں اور اربیحہ شام کو آپ کے ہاں آئیں گے'' اس نے مدھم لہجے میں کہا تھا۔

اور ان کی آنکھوں کی حیرت اسے شرمندہ کر گئی تھی۔

☆☆☆

ایک تھکا دینے والے بھرپور دن کے اختتام کے بعد وہ اس کے سامنے تھا۔

شاہ فضل نے آہستگی سے اسے قریب کر لیا۔

''اجازت ہے؟'' اس کا مدھم لہجہ بے پناہ پیار لیے ہوئے تھا۔

اربیحہ نے بے ساختگی سے مسکرا کر اسے دیکھا اور سر جھکا لیا۔

''تم بہت عظیم ہو اربیحہ! تم نے ناحق اتنے مظالم سہے میں..... میں بہت شرمندہ ہوں مگر..... مگر اب میرا وعدہ ہے کہ تمہیں بے پنا پیار دوں گا، اپنی ساری زیادتیوں کا ازالہ کر دوں گا۔''

اربیحہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''میں نے تمہیں رولایا ہے اربیحہ! مگر اب نہیں۔ اب صرف محبتیں ہی محبتیں ہوں گی۔ خوشیاں، پیار اور مسکراہٹیں۔ بس!'' وہ اس کی آنکھوں کو چومنے لگا۔

اربیحہ نے طمانیت سے آنکھیں موند لیں۔

.....❁.....